آیئے سوچیں! ہم نے پاکستان کو کیا دیا؟

اللہ جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا۔ (القرآن)

ماہنامہ نظریہ اسلام آباد

یکے از مطبوعات نظریہ پاکستان کونسل (ٹرسٹ)

رجسٹر نمبر ID-364

جلد 17، شمارہ 1-4

جمادی الثانی۔رمضان المبارک 1444ھ

جنوری۔اپریل 2023ء

قیمت 30 روپے

نظریۂ پاکستان

یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ حصولِ پاکستان کی جدوجہد کی بنیاد دوقومی قرآنی نظریہ تھا۔ 1930ء میں الہ آباد میں علامہ اقبال نے اپنے خطبہ میں اور پھر 1940ء میں قراردادِ پاکستان میں برصغیر کے مسلمانوں نے یہ مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں میں مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن بنایا جائے جہاں مسلمان اسلامی اصولوں کے مطابق آزادانہ زندگی بسر کریں۔

قائداعظم نے واضح کر دیا تھا کہ قرآن ہی ہماری اسلامی مملکت میں ایک زندہ متحرک نظریہ اور قانون کا ماخذ ہے۔ اسی کی روشنی میں قرآنی قوانین پر مبنی اسلامی مملکت کے عملی قیام سے پوری نوعِ انسانی کی منفعت اسلام کے ابدی پیغام کو دنیا کے سامنے لانا ہمارا نظریہ پاکستان کونسل (ٹرسٹ) اسلام آباد کا بنیادی و اولین مقصد ہے۔

اس شمارے میں

1۔ پاکستان کا مطلب کیا؟	پروفیسر اصغر سودائی	4
2۔ قرآن اولادِ آدم کیلئے ضابطۂ حیات	مولانا شبیر احمد عثمانی	5
3۔ قائداعظم اور جمہوریت	طارق شاہد	10
4۔ اقبال اور معاشی انصاف کی تلاش	پروفیسر فتح محمد ملک	12
5۔ ماہِ رمضان اور عید سے جڑی چند یادیں	نعیم فاطمہ علوی	17
6۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب صابر	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	20
7۔ ظفرِ ملت۔ظفر علی خان	سید ظہیر احمد گیلانی	23
8۔ قیامِ پاکستان میں درپیش مسائل	پروفیسر عفت گل اعزاز	27
9۔ سانحہ مشرقی پاکستان پر تحقیق	غزالہ عزیز	30
10۔ تصورِ پاکستان کی ارتقائی تاریخ	سید عاصم محمود	32
11۔ سرائیکی ناول "کچھ" کا مختصر جائزہ	محمد خان نیازی	34
12۔ نقطۂ نظر (رپورٹ)	حمید قیصر	37
13۔ خبرنامہ		اندرون بیک ٹائٹل

مجلس ادارت

ایگزیکٹو ایڈیٹر: گوہر زاہد ملک

ایڈیٹر: حمید قیصر

قانونی مشیر: ایم بلال سینئر ایڈووکیٹ

کمپوزنگ / گرافکس ڈیزائنر: حافظ اکرام محمود

فوٹوگرافر: عارف شیخ

چیف ایڈیٹر: میاں محمد جاوید (چیئرمین)

مجلس مشاورت

سینیٹر ایس ایم ظفر (سابق وفاقی وزیر)

سردار وزیر احمد جوگیزئی (سابق ڈپٹی سپیکر)

کنور محمد دلشاد (سابق سیکرٹری الیکشن کمیشن)

مسز فرخ خان (ایم۔این۔اے)

زرِ تعاون

چھ ماہ کے لئے (مع ڈاک خرچ) 250 روپے

ایک سال کے لئے (مع ڈاک خرچ) 500 روپے

پرنٹرز: العمر پرنٹرز، علی اکبر ہاؤس جی۔8 مرکز اسلام آباد

رابطہ

نظریہ پاکستان کونسل (ٹرسٹ) اسلام آباد

ایوانِ قائد فاطمہ جناح پارک ایف۔9 اسلام آباد

فون: 051-9334524, 2255633

E-mail: npctisb@gmail.com

Website: www.npctisb.pk

پاکستان کا مطلب کیا؟

تحریکِ پاکستان کی مقبول نظم

پروفیسر اصغر سودائی

پاکستان کا مطلب کیا، لا الہٰ الا اللہ

شب ظلمت میں گزاری ہے
اُٹھ، وقت بیداری ہے
جنگِ شجاعت جاری ہے
آتش و آہن سے لڑ جا

پاکستان کا مطلب کیا، لا الہٰ الا اللہ

چھوڑ تعلق داری چھوڑ
اُٹھ محمود، بتوں کو توڑ
جاگ، اللہ سے رشتہ جوڑ
غیر اللہ کا نام مٹا

پاکستان کا مطلب کیا، لا الہٰ الا اللہ

نغموں کا اعجاز یہی
نعرہ سوز ساز یہی
وقت کی ہے آواز یہی
وقت کی یہ آواز سُنا

پاکستان کا مطلب کیا، لا الہٰ الا اللہ

تجھ میں ہے خالد کا لہو
تجھ میں ہے طارق کی نمو
شیر کے بیٹے شیر ہے تُو
شیر بن اور میدان میں آ

پاکستان کا مطلب کیا، لا الہٰ الا اللہ

جرأت کی تصویر ہے تُو
ہمت عالمگیر ہے تُو
دنیا کی تقدیر ہے تُو
آپ اپنی تقدیر بنا

پاکستان کا مطلب کیا، لا الہٰ الا اللہ

پنجابی ہو یا افغان
مل جانا شرطِ ایمان
لے کے رہیں گے پاکستان
حکمِ نبیؐ منشائے خدا

پاکستان کا مطلب کیا، لا الہٰ الا اللہ

اے اصغر اللہ کرے
ننھی کلی پروان چڑھے
پھول بنے خوشبو مہکے
وقتِ دُعا ہے ہاتھ اُٹھا

پاکستان کا مطلب کیا، لا الہٰ الا اللہ

قرآن اولادِ آدم کے لئے مکمل ضابطۂ حیات

ہندوستان میں آبادی کی تقسیم قدرت کی طرف سے قیامِ پاکستان کا غیبی اشارہ ہے۔مولانا شبیر احمد عثمانی

☆ قرآن نے پوری اولادِ آدم کو بنیادی اور اصولی طور پر دو حصوں میں تقسیم کردیا: مومن ومسلم اور کافر۔(26 اکتوبر 1945)

☆ ہندوستان میں جو سیاسی کشمکش اس وقت جاری ہے میرے نزدیک اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابلِ تنفر بلکہ اشتعال انگریز جھوٹ اور سب سے بڑی اہانت آمیز دیدہ دلیری یہ ہے کہ یہاں کے دس کروڑ فرزندانِ اسلام کی مستقل قومیت کا صاف انکار کردیا جائے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ غلط یا صحیح طور پر دنیا میں اقوام کی تقسیم وطن، نسل، زبان اور طرز تمدن وغیرہ کے لحاظ سے ہوتی رہی ہے اور اب بھی موجود ہے۔لیکن خاتم الانبیاﷺ کی تشریف آوری سے دنیا کی جو تعمیر جدید ہوئی، اس میں تخلیق کے اعلیٰ ترین مقاصد کے پیشِ نظر، اللہ کے پیدا کئے ہوئے تمام انسانوں کی باعتبار قومیت ایسی تقسیم کردی گئی جس کے احاطہ سے کوئی فردِ بشر باہر نہ رہ سکے۔ اب اسلامی نقطۂ نظر سے گویا روئے زمین پر دو ہی قومیں آباد ہیں۔ایک وہ قوم جس نے فاطر ہستی کی صحیح معرفت حاصل کر کے اس کے مکمل اور آخری قانون کو اس کی زمین میں رائج کرنے کا التزام کرلیا وہ مسلم یا مؤمن کہلاتی ہے۔دوسری جس نے اپنے اوپر التزام نہیں کیا اس کا شرعی نام کافر ہوا۔ھوالذی خلقکم فمنکم کافر ومنکم مؤمن۔یاد رہے کہ ایمان وکفر کی یہ تقسیم حضورﷺ سے پہلے بھی تھی، لیکن آپ سے قبل چوں کہ ہر نبی کسی مخصوص قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا۔اسی لیے ان کی بعثت سے قومتیوں کے قائم شدہ امتیازات کلیتاً مٹائے نہیں جاسکتے تھے۔البتہ رحمتہ للعالمین اور نذیر للعالمین کی بعثت عامہ نے جو کسی ملک وخاندان یا زبان ومکان سے مقید نہ تھی، ان تمام چھوٹے چھوٹے تشخصات اور محدود امتیازات کی قدر و قیمت گھٹادی یا ختم کر دی، جن کو لوگوں نے اپنے جہل وتنگ نظری سے شرافت وکرامت کا اصلی معیار بنا رکھا تھا۔

(پیغام بنام آل انڈیا جمیعۃ العلمائے اسلام کانفرنس کلکتہ 26 اکتوبر 1945)

☆ اس اساسی نقطۂ نظر سے لامحالہ کل غیر مسلم قومیں دوسری قوم سمجھی جائیں گی اور اب اس چیز کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہتا کہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کے امتزاج سے کوئی قومیت متحدہ صحیح معنی میں بن سکے۔

ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں۔اس قوم کی وحدت اور شیرازۂ بندی کے لئے ضرورت ہے کہ اس کا کوئی مستقل مرکز ہو جہاں سے اس کے قومی محرکات اور عزائم فروغ پاسکیں اور جہاں سے وہ مکمل آزادی اور مادی اقتدار کے ساتھ اپنے خدائی قانون کو بے روک ٹوک نافذ کر سکے، بلکہ اس بے مثال قانون عدل وحکمت کا کوئی عملی نمونہ قائم کر کے دنیا کو وہ مشعل ہدایت دکھلا سکے۔جس کی آج ہمیشہ سے زیادہ دنیا کو ضرورت ہے۔

☆ پاکستان کا غیبی اشارہ

یہ بھی اللہ کی عجیب قدرت وحکمت کی نشانی ہے کہ باوجودیکہ مسلمان اس ملک میں مجموعی طور پر دوسری اقوام سے کم تعداد میں ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے ہماری اس کمی کو ملک کے تمام صوبوں میں مساوی نسبت پر تقسیم نہیں کیا، بلکہ بعض صوبوں میں جو جغرافیائی حیثیت سے اہم بھی ہیں ہم کو دوسروں کے مقابلے میں اکثریت عطا فرمادی۔ یہ گویا قدرت کی طرف سے پاکستان قائم کرلینے کا امکان کی طرف ایک غیبی اشارہ ہے۔ بہرحال اس کا نام پاکستان رکھو یا حکومتِ الٰہیہ اور کوئی

کچھ۔اتنی بات میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں اور ان کے لئے ایک مستقل مرکز کی ضرورت ہے جو اکثریت واقلیت کی مخلوط حکومت میں کسی طرح حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہاں کی دونوں قوموں کے مناقشات کا حل بھی اسی توازن کے قائم کرنے میں ہے کہ دونوں کو اپنے اپنے مستقر اور مرکز میں پوری آزادی نصیب ہو اور اس طرح طبعی طور پر دونوں آزاد ریاستیں اپنی اپنی اقلیتوں کے تحفظ کا انتظام درست رکھنے پر مجبور ہوں۔ دونوں مل کر معاہداتی سسٹم کے تحت پورے ملک کو خوشحال اور پر امن رکھنے کی جدوجہد کریں اور باہمی تعاون سے ملک کو ہر جہتی ترقی دینے میں کوشاں ہوں۔

اگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہوا اور یہاں کی اکثریت نے مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنی تنگ نظری تعصب اور تاریک ترین پست خیالی نہ چھوڑی تو ملک کے لئے آزادی کامل کی توقع رکھنا اپنے نفس کو خود فریب دینا ہے۔ جذباتی لوگ جو چاہیں کہتے رہیں۔حقیقت پسند جانتے ہیں کہ ایسی صورت میں ایسی امیدیں باندھنا شیخ چلی کے منصوبوں سے کم نہیں۔الحاصل آج مسلم قوم سے یہ توقع ہرگز نہ رکھیے کہ وہ انگریز کی سنگل اور اضطراری غلامی کے مقابلہ میں انگریز اور ہندو کی ڈبل اور اختیاری غلامی کو ترجیح دے گی۔

☆ اسلام کا مقصد___پاکستان

اسلام کا مقصد اہم اپنے پیروؤں کے ذریعہ ایک ایسی قومیت کی تشکیل کرنا ہے جو وطن، نسل، رنگ، پیشہ اور مختلف اقوام کی قائم کردہ معاشرتی خصائص سے بالاتر ہو، ہندوستان میں چوں کہ اس عظیم الشان قوم کے عناصر اس قدر عظیم ترین تعداد میں موجود ہیں جس کی نظیر کسی دوسرے خطے میں نہیں مل سکتی۔اس لیے اشد ضروری ہے کہ یہاں اس قوم مسلم کا کوئی آزاد اور مستقل مرکز ہو۔ایسے مرکز کا قیام دنیا کی موجودہ سیاست کے اصول مرجہ کے ماتحت صرف ان ہی صوبوں میں ممکن ہے جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہو۔ اس مرکز کا نام اصطلاحی طور پر "پاکستان" یا کچھ اور ہو۔ بہرحال اس کے قیام سے یہ غرض نہیں کہ خواہ مخواہ ہمسایہ اقوام سے لڑائی مول لی جائے، بلکہ ایک مناسب، منصفانہ اور معتدل تقسیم کے ذریعہ یہاں کے روزانہ پیش آنے والے فروعی مناقشات کا بڑی حد تک سدِ باب مقصود ہے اور سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ آزاد اور طاقتور مرکز سے کسی دوسری قوم کے ساتھ صلح یا جنگ کی جو کچھ تجویز ہوگی وہ طاقتور مؤثر اور منظّم ہوگی اور پورا ملک ہندو جو فوائد وفاقی حکومت سے حاصل کرتا ہے وہ "پاکستان" اور "ہندوستان" کے نہایت مستحکم معاہداتی سسٹم سے کر سکے گا۔

ضرورت ہے کہ ہم قرارداد مقاصد کو خفاش صفت ثابت نہ کریں جو دن کی روشنی کو دیکھنے کی تاب نہیں لاسکتی۔ پاکستان مادیت کے بھنور میں پھنسی ہوئی اور دہریت والحاد کے اندھیروں میں بھٹکی ہوئی دنیا کو روشنی کا ایک مینار دکھانا چاہتا ہے۔ یہ دنیا کے لئے کوئی چیلنج نہیں بلکہ انسانیت کے لئے پر امن پیغام حیات ونجات اور اطمینان اور خوش حالی کی راہ تلاش کرنے والوں کے لئے سہولت مہیا کرتا ہے۔ ہمارا غیر متزلزل عقیدہ ہے کہ دنیا کے لئے عموماً اور پاکستان کے لئے خصوصا کسی قسم کا نظام تجویز کرنے سے پہلے پوری قطعیت کے ساتھ یہ جان لینا ضروری ہے کہ اس تمام کائنات کا جس میں ہم سب اور ہماری یہ مملکت بھی شامل ہے، مالک اصلی اور حاکم حقیقی کون ہے اور ہے یا نہیں۔اب اگر ہم اس کا مالک کسی خالق الکل اور مقتدر اعلیٰ ہستی کو مانتے ہیں (جیسا کہ میں خیال کرتا ہوں کہ اس ایوان کے تمام ارکان واعضاء کا یہ عقیدہ ہوگا) تو ہمارے لئے یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہوگا کہ کسی کی خصوصاً اس مالک علیٰ الاطلاق کی ملک میں ہم اسی حد تک تصرف کرنے کے مجاز ہیں جہاں تک کہ وہ اپنی مرضی سے ہمیں اجازت دے دے۔ مِلک غیر میں کوئی غاصبانہ تصرف ہمارے لئے جائز نہیں ہوسکتا۔ پھر ظاہر ہے کہ کسی مالک کی اجازت ومرضی کا علم اس کے بتلانے ہی سے ہوسکتا ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسی لئے بھیجے اور وحی ربانی کا سلسلہ اسی لیے قائم کیا کہ انسانوں کو

قائداعظم مرحوم نے اگست 44ء میں گاندھی جی کے نام جو خط لکھا تھا اس میں لکھتے ہیں:

"قرآن مسلمانوں کا ضابطہ حیات ہے۔اس میں مذہبی اور مجلسی، دیوانی اور فوجداری، عسکری اور تعزیری، معاشی اور معاشرتی شعبوں کے احکام موجود ہیں۔ مذہبی رسوم سے امور حیات تک، روح کی نجات سے جسم کی صحت تک، جماعت کے حقوق سے فرد کے حقوق تک، دنیوی زندگی میں جزا وسزا سے عقبیٰ کی جزا وسزا تک، ہر فعل اور حرکت پر مکمل احکام کا مجموعہ ہے

اس کی مرضی اوراجازت کے صحیح حدود معلوم کرادیئے جائیں۔اسی نقطہ وخیال کے پیش نظر ریزولیوشن (قرارداد مقاصد) میں "اسی کے مقرر کردہ حدود کے اندر" کے الفاظ رکھے گئے ہیں اور یہ ہی وہ بنیادی نقطہ ہے جہاں سے دینی اور خالص مادی حکومتوں کی لائنیں ایک دوسرے سے الگ ہوجاتی ہیں۔

یہ نظریہ کہ دین ومذہب کا تعلق انسان اور اس کے مالک سے ہے، بندوں کے باہمی معاملات سے اسے کچھ سروکار نہیں نہ سیاست میں اس کا کوئی دخل ہے، اسلام نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ممکن ہے دوسرے مذاہب جو آج کل دنیا میں موجود ہیں، ان کے نزدیک یہ نظریہ درست تو ہو کہ وہ خود کسی جامع وحاوی نظامِ حیات سے تہی دامن ہیں۔مگر جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، ایسے تصور کی اس میں کوئی گنجائش نہیں بلکہ اس کی تمام تر تعلیمات اس باطل تصور کی دشمن ہیں۔

قائداعظم مرحوم نے اگست 44ء میں گاندھی جی کے نام جو خط لکھا تھا اس میں لکھتے ہیں:

"قرآن مسلمانوں کا ضابطہ حیات ہے۔اس میں مذہبی اور مجلسی، دیوانی اورفوجداری، عسکری اورتعزیری، معاشی اور معاشرتی غرض کہ سب شعبوں کے احکام موجود ہیں، مذہبی رسوم سے لے کر روزانہ کے امورحیات تک، روح کی نجات سے لے کر جسم کی صحت تک، جماعت کے حقوق سے لے کر فرد کے حقوق تک، دنیوی زندگی میں جزاوسزا سے لے کر عقبیٰ کی جزا وسزا تک، ہر فعل اور حرکت پر مکمل احکام کا مجموعہ ہے۔لہٰذا جب میں یہ کہتا ہوں کہ مسلمان ایک قوم ہے تو حیات ومابعد حیات کے ہر معیار اور ہر مقدار کے مطابق کہتا ہوں"۔

"ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآنی تعلیمات محض عبادات واخلاقیات تک محدود نہیں بلکہ قرآن کریم مسلمانوں کا دین وایمان اور قانونِ حیات ہے۔یعنی مذہبی، معاشرتی، تجارتی، تمدنی، عسکری اورتعزیری احکام کا مجموعہ ہے۔ ہمارے رسول اللہ ﷺ کا ہم کو یہ حکم ہے کہ ہر مسلمان کے پاس اللہ کے کلام پاک کا ایک نسخہ ضرور ہو اور وہ اس کو بغور وخوض مطالعہ کرے تاکہ یہ اس کی انفرادی واجتماعی ہدایات کا باعث ہو"۔

قائداعظم نے ان خیالات وعزائم کا بار بار اظہار کیا ہے۔کیا ایسی واضح اور مکرر تصریحات کے بعد کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ سیاست و حکومت مذہب سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی یا یہ کہ اگر آج قائداعظم زندہ ہوتے تو یہ تجویز مقاصد پیش نہیں ہوسکتی تھی۔

قرآن مجید میں صاف صاف ارشاد ہے:

"پروردگار کی قسم! یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں آپ کو منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ آپ کریں اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں، تب تک مومن نہیں ہوں گے"۔(النساء4:65)

"اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں۔اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں۔(المائدہ:44 تا47)

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام میں دینی حکومت کے معنی پاپائیت یا" کلیسائی حکومت" کے نہیں۔بھلا جس بت کو قرآن نے اتخذوا احبارھم اربابا من دون اللہ کہہ کر توڑا ہے کیا وہ اسی کی پرستش کو جائز رکھ سکتا ہے؟

اسلامی حکومت سے مراد وہ حکومت ہے جو اسلام کے بتائے ہوئے اعلیٰ اور پاکیزہ اصول پر چلائی جائے۔اس لحاظ سے وہ ایک خاص قسم کی اصولی حکومت ہوگی۔ ظاہر ہے کہ کسی اصولی حکومت کو چلانا خواہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی (جیسے روس کی اشتراکی حکومت) دراصل ان ہی لوگوں کا کام ہوسکتا ہے جو ان اصولوں کو مانتے ہوں۔جو لوگ ان اصولوں کو نہیں مانتے ایسی حکومت یا انتظام مملکت میں ان کی خدمات تو ضرور حاصل کرسکتی ہے مگر مملکت کی جنرل پالیسی یا کلیدی انتظام کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں نہیں چھوڑی جاسکتی۔

اسلامی حکومت اصل میں انسانی حکومت نہیں بلکہ نیابتی حکومت ہے۔ اصل حاکم خدا ہے، انسان زمین پر اس کا خلیفہ (نائب) ہے جو حکومت کے اصول پر دوسرے مذہبی فرائض کی طرح نیابت کی ذمہ داریوں کو بھی خدا کی مقرر کردہ حدود کے اندر پورا کرتا ہے۔

مکمل اسلامی حکومت، حکومت راشدہ ہوتی ہے۔لفظ "رشد" حکومت کے انتہائی اعلیٰ معیار حسن وخوبی کو ظاہر کرتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت، حکومت کے کارکن اور مملکت کے عوام کو نیکوکار ہونا چاہیے۔قرآن نے حکومت اسلامی کی یہ ہی غرض وغایت قرار دی ہے کہ وہ انسانوں کو اپنے دائرہ اقتدار میں نیکیوں کا حکم دے اور برائیوں سے روکے۔ اسلام آج کل کی سرمایہ پرستی کے خلاف ہے۔اسلامی حکومت اپنے خاص طریقوں سے جو اشتراکی طریقوں سے

الگ ہیں، جمع شدہ سرمایہ کی مناسب تقسیم کا حکم دیتی ہے۔اس کو دائرہ وسائرہ رکھنا چاہتی ہے۔مگر اس کام کو اخلاقی ونیز قانونی طریقہ پر عام خوشدلی، عدل اور اعتدال کے ساتھ کرتے ہوئے اسلامی حکومت شخصی ملکیت کی نفی نہیں کرتی۔ مناسب حد تک راس المال رکھنے کی اجازت دیتی ہے۔زاید سرمایہ کے لئے ملی بیت المال قائم کرتی ہے جس میں سب کے حقوق مشترک ہیں اور اس سرمایہ کی تقسیم سے سرمایہ اور افلاس کے درمیان توازن اور اعتدال کو بحال رکھتی ہے۔

شوریٰ اسلامی حکومت کی اصل ہے۔وامرھم شوریٰ بینھم۔(الشوریٰ42:38)(اور وہ اپنے کام آپ کے مشورے سے کرتے ہیں) اسلامی حکومت دنیا میں پہلا ادارہ ہے جس نے شہنشاہت کو ختم کر کے استصواب رائے عامہ کا اصول جاری کیا اور بادشاہ کی جگہ عوام کے انتخاب کردہ امام (قائد حکومت) کو حکومت عطا کی۔محض جبر واستبداد کے راستوں سے بادشاہ بن بیٹھنا اسلام کے منشاء کے سراسر خلاف ہے۔وہ جمہور کی مرضی اور ان ہی کے ہاتھوں سے اسٹیٹ کو اختیار دلاتا ہے۔ہاں انہیں یہ حق نہیں دیتا کہ وہ امارت کی کوئی تنظیم نہ کریں اور اقتدار اپنے ہی پاس روک کر انتشار، ابتری اور طوائف الملو کی پھیلادیں۔ یہ اولیت کا ایسا شرف ہے جو اسلامی حکومت کو دنیا کی تمام جمہوریتوں پر حاصل ہے۔

اسلامی سلطنت کا بلند ترین منتہائے خیال یہ ہے کہ سلطنت کی بناء جغرافیائی، نسلی، قومی، حرفتی اور طبقاتی قیود سے بالاتر ہو کر انسانیت اور ان اعلیٰ اصولوں پر ہو جن کی تشدید وترویج کے لئے وہ قائم کی جاتی ہے۔

اسلامی حکومت پہلی حکومت ہے جس نے اس منتہائے خیال کو پورا کرنے کے لئے اپنی خلافت راشدہ کی بنیاد انسانیت پر رکھی۔ یہ حکومت اپنے کاموں میں رائے عامہ، مساوات حقوق، آزادی ضمیر اور سادگی کا امکانی حد تک خیال رکھتی ہے۔

اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ اپنے قلمرو میں بسنے والے تمام غیر مسلموں سے جو شرائط طے ہوئے ہوں، جان، مال، آبرو، مذہبی آزادی اور عام شہری حقوق کی پوری حفاظت کرے۔اگر کوئی طاقت ان کے جان ومال وغیرہ پر دست اندازی کرے تو حکومت اس سے جنگ کرے اور ان پر کوئی ایسا بار نہ ڈالے جو ان کے لیے ناقابل تحمل ہو۔جو ملک صلحاً حاصل ہوا ہو وہاں کے غیر مسلموں سے جو شرائط طے ہوں ان کی پوری پوری پابندی کی جائے۔ پھر غیر مسلموں کے یہ حقوق محض اکثریت کے رحم وکرم پر نہیں بلکہ خدا کا عائد کیا ہوا ایک فرض ہے جس سے کسی وقت انحراف جائز نہیں۔

اس کے بعد دینی حکومت کی مزعومہ خرابیوں کا جہاں تک تعلق ہے۔ جواب میں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ علم تحقیق کی روشنی میں موجودہ ترقی یافتہ حکومتوں کے طور طریقوں کو خلفائے اربعہ کے بے داغ عہد حکومت کے مقابلہ میں رکھ کر مفاد عامہ کے لحاظ سے وزن کرلیا جائے۔آج ظلم وجبر، عہد شکنی، مالی دست برد، کشت وخون، بربادی وہلاکت، انسانی جماعتوں کی باہمی دشمنی، افراد کی عدم مساوات اور جمہور کے حقوق کی پامالی کی جو مثالیں دوربین سے دیکھے بغیر نظر آرہی ہیں، خلفاء کے ترقی یافتہ عہد میں اس کا خفیف سا نشان بھی نہ ملے گا۔ غرضیکہ بیان کردہ خرابیاں مذہبی حکومت کی خرابیاں نہیں ہیں بلکہ ان انسانی گمراہیوں سے اخذ کی گئی ہیں جنہوں نے خالص مادی طرزِ حکومت کی داغ بیل ڈالی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ گاندھی جی نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا تھا جب 1937ء میں کانگریسی وزراء کو یہ ہدایات دی تھیں کہ تم ابوبکرؓ اور عمرؓ کی سی حکومت قائم کرو۔ نیز قائداعظم مرحوم نے دستور کی اسی اساس کی طرف اشارہ کیا تھا جب 43ء میں بمقام جالندھر آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا کہ "میرے خیال میں مسلمانوں کا طرزِ حکومت آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل قرآن حکیم نے فیصل کردیا تھا"۔انہوں نے نومبر 45ء میں پیر صاحب مانکی شریف کے نام جو خط لکھا اس میں صاف صاف لکھ دیا تھا کہ "اس بات کے کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ قانون بنانے والی جماعت جس میں بہت زیادہ اکثریت مسلمانوں کی ہوگی، پاکستان کے لئے ایسے قانون بنا سکے گی جو اسلامی قانون کے خلاف ہو اور نہ ہی پاکستانی غیر اسلامی قانون پر عمل کرسکیں گے"۔اس قسم کے اعلانات قیام پاکستان سے پہلے قائداعظم اور دوسرے زعماء لیگ کی طرف سے برابر ہوتے رہے جن کا بخوف طوالت ہم استیعاب نہیں کرسکتے۔ بہر حال ان بیانات کے پڑھنے کے بعد کسی مسلم یا غیر مسلم کو ہمارے مقصد اور مطمع نظر کو سمجھنے میں کوئی ابہام واشتباط نہیں رہ سکتا اور جس قدر باتیں آئین ونظامِ اسلامی کے متعلق بطور اعتراض کہی جارہی ہیں ان سب کے سوچنے کا وقت وہ تھا جب پوری صراحت کے ساتھ یہ اعلانات کیے جارہے تھے۔ جب یہ سب کچھ جان کر اور سمجھ کر دوسری قوم نے تقسیم ہند کے فیصلہ پر دستخط کیے اور پاکستان کی اقلیت نے ان مقاصد کو مانتے ہوئے ہمارے ساتھ اشتراک عمل کیا۔اب

پاکستان قائم ہونے کے بعد اس نقطہ نظر سے انحرف کی کوئی وجہ جواز ان کے پاس موجود نہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ انڈین یونین کا قیام تو ہندو اور نیشلسٹ مسلمانوں کی مخلوط مساعی سے عمل میں آیا ہے لیکن پاکستان کا حصول خالص مسلم قوم کی مساعی اور قربانیوں کو مرہون منت ہے اور ان کی قومی خصائص و ممیّزات کے تحفظ کا داعیہ اس کا محرک ہوا ہے۔ اب اگر ایسی سیدھی اور صاف بات کو بھی بھلا دیا جائے تو اس کا کچھ علاج ہمارے پاس نہیں۔

اس موقع پر یہ بات بھی فراموش نہ کیجئے کہ آج دنیا میں معاشی اختلال اور اقتصادی عدم توازن کی وجہ سے ملحدانہ اشتراکیت (کمیونزم) کا سیلاب ہر طرف سے بڑھتا چلا آرہا ہے اس کا صحیح اور اصولی مقابلہ اگر دنیا میں کوئی نظام کرسکتا ہے تو وہ صرف اسلام کا اقتصادی نظام ہے۔ اگر ہم پاکستان یا عالم اسلامی کو اس بھیانک خطرہ سے بچانا چاہتے ہیں تو اس کی واحد صورت یہ ہی ہے کہ پاکستان اس کی انتہائی منزل مقصود واضح اور مستحضر ہو جائے تا کہ اس کی روشنی میں ہمارا جو قدم اٹھے وہ ہم کو آخری منزل سے قریب تر کرنے والا ہو۔ یہ کام ظاہر ہے کہ بتدریج ہوگا اور بتدریج ہی ہوسکتا ہے۔ جو کام فی الحال کیے جا سکتے ہیں وہ فوراً کرنے ہوں گے جن کاموں کے لئے سر دست حالات ساز گار نہیں وہ فوراً نفاذ پذیر نہ ہوں گے بلکہ حکیمانہ اسلوب پر حالات کو سازگار بنانے کی ہر امکانی کوشش عمل میں لائی جائے گی۔ بہر حال انسان اسی چیز کا مکلّف ہے جس کی وہ استطاعت رکھتا ہے۔ یہ ہی وہ بات ہے جو میں تقسیم سے قبل اپنے مختلف بیانات وخطبات میں کھل کر کہہ چکا ہوں۔ چنانچہ خطبہ لاہور میں، میں نے عرض کیا تھا کہ یہ اعلیٰ اور پاک نصب العین سے قریب تر کرے گا۔ جس طرح رات کی تاریکی آہستہ آہستہ کم ہوتی اور دن کی روشنی بتدریج پھیلتی ہے یا جس طرح ایک پرانا مریض دھیرے دھیرے صحت کی طرف قدم اٹھاتا ہے دفعتاً وبغتۃً بیماری سے

قائداعظم مرحوم نے دستور کی اسی اساس کی طرف اشارہ کیا تھا جب 43ء میں بمقام جالندھر آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا کہ "میرے خیال میں مسلمانوں کا طرزِ حکومت آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل قرآن حکیم نے فیصل کردیا تھا"

میں صحیح اسلامی نظام کا اعلان وآغاز کریں اور تمام اسلامی ممالک کو اسلام کے نام پر اسی کی دعوت دیں اگر اس طرح تمام اسلامی ممالک آئینی طور پر متحد ہو گئے تو قدرتی طور پر وہ وحدت اسلامی قائم ہو جائے گی جس کی ہم سب مدت سے آرزو رکھتے ہیں اور جو اشتراکیت اور سرمایہ پرستی دونوں کی روک تھام کے لئے مضبوط آہنی دیوار کا کام دے گی۔

بہت سے لوگوں کو یہ خیال گزرتا ہے کہ ابھی تک ہمارا کاروبار جس ڈگر پر چل رہا ہے اسلامی نظام اور اسلامی آئین کا اعلان کر کے ہم اسے ایک دم کیسے بدل سکتے ہیں۔ یہ تو ہمارے اجتماعی حالات میں ایسا انقلاب عظیم ہوگا جو ہماری قومی زندگی کی کایا پلٹ کر رکھ دے گا اور جس کے لئے ہمیں جدید کانسٹیٹیوشن کے چلانے کے لئے کثیر تعداد میں مناسب رجال کار تیار کرنے پڑیں گے اور بہت طویل عرصہ درکار ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ ان حضرات کا یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے۔ لیکن اسلامی نظام کا مطالبہ کرنے والے بھی اسے بخوبی محسوس کرتے ہیں۔ اسلامی آئین ونظام کے اعلان سے غرض یہ ہے کہ مملکت کا اصلی نصب العین اور چنگا نہیں ہو جاتا، اسی طرح پاکستان ہماری قومی صحت اور ہماری مکمل ترین آزادی کے نصف النہار کی طرف تدریجی قدم اٹھائے گا۔

جناب صدر محترم! آخر میں ایوان ہذا کے معزز ممبران کی خدمت میں، میں عرض کروں گا کہ اس ڈھیلے ڈھالے ریزولیوشن سے گھبرانے اور وحشت کھانے کی کوئی وجہ نہیں۔ اسلامی فرقوں کے اختلاف تحریکِ پاکستان کی برکت سے بہت کم ہو چکے ہیں اور اگر کچھ باقی ہیں تو ان شاءاللہ برادرانہ مفاہمت سے صاف ہو جائیں گے کیوں کہ تمام اسلامی فرقے اور ملک آج اسلامی نظام کی ضرورت کو بہت شدت کے ساتھ محسوس کر رہے ہیں اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارے غیر مسلم دوست بھی اگر ایک مرتبہ تھوڑا سا تجربہ کر کے دیکھ لیں گے تو اگلی اور پچھلی سب تلخیاں بھول جائیں گے اور بہت مطمئن رہیں گے بلکہ فخر کریں گے کہ ہم سب پاکستان نے مل کر عام ہیجان اور اضطراب کے زمانہ میں انسانیت عامہ کی اس قدر عظیم الشان خدمت انجام دی۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز (ابراہیم 20:14) (اور یہ اللہ تعالیٰ کو کچھ بھی مشکل نہیں)۔

قائداعظم اور جمہوریت

طارق شاہد شعبہ تعلقاتِ عامہ

قائداعظم محمد علی جناح جیسی مقتدر ہستیاں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں سال بعد پیدا ہوتی ہیں۔ ایک شخصیت میں ہمہ گیر اوصاف کا یک جا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ خدا نے ان کو مسلمانانِ برصغیر کا رہنما اور نجات دہندہ بنا کر بھیجا۔ ان کی ولولہ انگیز قیادت سے نہ صرف پاکستان کا قیام عمل میں آیا بلکہ قوم کو ایک صحیح سمت میں گامزن ہونے کی راہ بھی مل گئی۔ قائداعظم اپنی قوم سے بے لوث اور مخلص تھے۔ وہ مضبوط قوتِ ارادی اور بلند کردار رکھنے والے ایک بااصول لیڈر تھے۔ ان کی وفات کے بعد پیش آنے والے تدریجی عمل اور تاریخی واقعات نے یہ ثابت کردیا کہ یہ آزاد اور خودمختار ریاست جسے عدیم المثال قربانیاں دے کر حاصل کیا گیا تھا۔ کڑی آزمائش سے دوچار ہوگئی اور ہمیں مِن حیث القوم ایسی صعوبتوں اور مشکل مراحل سے گزرنا پڑا جسے ہم بدنصیبی ہی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام اور جمہوریت کے حوالے سے اور مسلم تہذیب وثقافت کیلئے بھی کوششیں جاری رہیں مگر کچھ ناپختگی، نیتوں کے فتور، صدق واخلاص کی کمی کی وجہ سے کوئی بھی تعمیری جدوجہد کامیاب نہ ہوسکی۔ پاکستان میں ایک اسلامی معاشرہ اور آزاد جمہوریت تشکیل پانا چاہیے تھی اور انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں اسلامی انقلاب آنا چاہیے تھا مگر کچھ نہ ہوا اس کی ظاہری وجہ صرف اور صرف مفاد پرستی، اقرباپروری اور حصول اقتدار کی رسا کشی تھی۔ ذاتی مفاد کیلئے جمہوریت کا گلا گھونٹا گیا، اسلامی اقدار کو پامال کیا اور اپنی منزل سے بھٹک گئے۔

قائداعظم ایک جمہوری اسلامی مملکت کے قیام کے خواہاں تھے۔ تحریک پاکستان بھی مسلمانانِ ہند کا ایک جمہوری طریقہ کار تھا کیونکہ اس تحریک کی بنیاد ''حق خود ارادیت'' ایک طے شدہ جمہوری پر اصول تھی۔ اس تحریک کا پس منظر مسلمانوں کی مذہبی، ثقافتی، معاشی، سماجی اور سیاسی زندگی کو عوام کی مرضی کے مطابق ڈھالنا اور اسے آگے بڑھانا تھی۔ قائداعظم نے اسی جمہوری اصول کی بنا پر 46-1945 میں قیام پاکستان کا فیصلہ انتخاب کے ذریعے قوم پر چھوڑ دیا تھا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ لکھنوء سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا:

"اسلامی تعلیمات کی درخشندہ روایات واقدار اس امر پر شاہد ہیں کہ دنیا کی کوئی قوم جمہوریت میں مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی جو کہ اپنے مذہب میں بھی جمہوری نقطہ نظر رکھتے ہیں"۔

قراردادِ پاکستان کی منظوری کے وقت لاہور میں قائداعظم نے اپنے خطبہ صدارت میں پاکستان کے مقاصد بیان کرتے ہوئے کہا:

"ہمیں ایک آزاد خودمختار قوم کی حیثیت سے اپنے ہمسایوں کے ساتھ امن وسکون سے رہنا چاہتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ ہماری قوم اپنے نظریات اور مزاج کے مطابق اپنی روحانی، تمدنی، معاشی اور سیاسی زندگی کی بھرپور نشوونما کرے"۔

ان کے ذہن میں پاکستان کے وجود کا منشا ایک علیحدہ مملکت کو دنیا کے نقشہ پر لانا نہیں تھا بلکہ ایسا اسلامی معاشرہ قائم کرنا تھا جس میں مسلمانانِ ہند اپنی زندگیوں کو صحیح اسلامی خطوط پر ڈھال سکیں، ہر شخص کو بنیادی ضرورتیں میسر آسکیں اور حقداروں کا انکا حق مل سکے اور زمین پر صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم ہوسکے۔

تحریک پاکستان کی قیادت کیلئے اس وقت قائداعظم سے بہتر رہنما اور مسلم لیگ کو ان سے بہتر صدر نہیں مل سکتا تھا۔ اسی لئے انہیں آل انڈیا مسلم لیگ کا تاحیات صدر بننے کی پیش کش کی گئی تھی مگر آپ نے اسے مسترد کرتے ہوئے کہا تھا:

"مجھے ہر سال کے اختتام پر اپنے روبرو آنے دیجئیے اور اعتماد کا ووٹ جیتنے دیجئیے۔ اپنا صدر اسے منتخب کیجئیے جو اچھے کردار کی بدولت آگے آئے"۔

ان کا یہ فرمان ان کی جمہوریت پسندی کی بیّن دلیل ہے۔

قیام پاکستان سے پہلے قائداعظم نے جتنے بھی سیاسی فیصلے کیے ان میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی اور کونسل کی رائے شامل ہوتی تھی۔ قائداعظم کے سیاسی کیریئر سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہ جمہوریت پسند تھے۔ مسلم لیگ کونسل کے اجلاس باقاعدگی سے ہوتے تھے۔ اہم اور فوری فیصلوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ جن میں 1942 میں ویول منصوبے کے مطابق عبوری حکومت میں شامل نہ ہونے کا فیصلہ اور پھر 1946 میں عبوری حکومت میں شرکت کا فیصلہ۔ 1946 میں راست اقدام کا فیصلہ اور 1947 میں ماؤنٹ بیٹن منصوبے کو تسلیم کرنے کا فیصلہ۔ یہ سب فیصلے مسلم لیگ کی مرضی سے جمہوری طریقے پر کئے گئے اور وقت کی ضرورت کے مطابق سارے فیصلے احسن تھے۔

قائداعظم ایسے لیڈر تھے جن کے فرمان پر قوم آنکھ بند کرکے عمل کرنے کیلئے تیار رہتی تھی مگر آئینی اور جمہوری طریقہ کار قائداعظم کو کس قدر عزیز تھا اس کا اندازہ کیمبل جانسن کی تصنیف ''Mission with Mount Baitan'' میں اس تحریر سے لگایا جاسکتا ہے وہ لکھتے ہیں:

> "2 جون، 1947 کو جب ماؤنٹ بیٹن نے اپنا منصوبہ پیش کیا تو پنڈت نہرو نے اسے فی الفور تسلیم کرلیا لیکن قائداعظم نے اپنا فیصلہ مسلم لیگ کی ورکنگ کونسل اور عوام کے مشورے کے بعد دیا"۔

قیام پاکستان کے بعد بھی قائد جمہوری اصولوں پر کاربند رہے۔ وہ آئین ساز اسمبلی کے اقتدار اعلیٰ پر یقین رکھتے تھے ان کا کہنا تھا کہ آئین ساز اسمبلی جو بھی فیصلہ کرے اس پر گورنر جنرل کی مہر کی تصدیق کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے آئین ساز اسمبلی کے فیصلوں پر کبھی اثرانداز ہونے کی کوشش نہیں کی۔

اپنی اکثر تقریروں میں قائداعظم نے جمہوریت اور اسلام کو ہر طریقہ سے قوم پر واضع کیا اور اپنے نظریات کو قوم کے سامنے پیش کرکے ترقی اور خوشحالی کی راہیں متعین کیں۔ 21 مارچ 1948 کو ڈھاکہ کے جلسہ عام میں حکومت اور اقتدار کے بارے میں کہا:

> " آخر حکومت کا مقصد کیا ہے۔ حکومت کے سامنے صرف ایک ہی مقصد ہوسکتا ہے۔ عوام کی بے لوث خدمت ان کی فلاح و بہبود کیلئے مناسب تدابیر اختیار کرنا۔ اس کے سوا برسراقتدار حکومت کا مقصد کیا ہوسکتا ہے، اگر کوئی اور مقصد اس کے سامنے ہے تو ایسی حکومت کو اقتدار سے برطرف کردیجیے لیکن ہلڑ بازی سے نہیں، اقتدار آپ کے پاس ہے، آپ کی چیز ہے آپ کو سیاسی نظام کے رموز و اسرار اور طریق کار کو سیکھنا اور آزمانا چاہیے۔ آئینی طور پر یہ آپ کے اختیار میں ہے کہ اگر کسی حکومت سے آپ مطمئن نہ ہوں تو اسے برطرف کردیں اور اپنی مرضی کی حکومت قائم کرلیں"۔

پاکستان کے دستور کے متعلق قائداعظم نے فروری 1948 میں امریکی قوم کے نام ایک نشریئے میں کہا:

> "میں نہیں جانتا کہ انجام کار اس دستور کی شکل کیا ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ دستور جمہوری نوعیت کا حامل ہوگا اور اسلام کے ضروری اصول اس میں شامل ہونگے ۔ اسلام نے ہمیں جمہوریت کا سبق دیا ہے اور انسانوں کے درمیان مساوات سکھائی ہے، ہر شخص کے ساتھ انصاف اور معقولیت کی تعلیم دی ہے"۔

اسلام کے جمہوری اصولوں کا ذکر کرتے ہوئے قائداعظم نے 14 فروری، 1948 کو سبی دربار سے خطاب کرتے ہوئے کہا :

> " میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات کا ذریعہ اس سنہری اصولوں والے ضابطِ حیات پر عمل کرنا ہے جو عظیم اور واضح قانون پیغمبر اسلام ﷺ نے ہمارے لیے قائم کررکھا ہے۔ ہمیں اپنی جمہوریت کی بنیادیں سچے اسلامی اصولوں اور تصورات پر رکھنی چاہیں کیونکہ اسلام کا سبق یہ ہے کہ مملکت کے امور و مسائل کے بارے میں فیصلے باہمی بحث تمحیص اور مشوروں سے کیا کرو"۔

قائداعظم کی تقریروں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قیام پاکستان سے ان کا مقصد کیا تھا اور پاکستان میں کس قسم کا معاشی، سیاسی اور سماجی نظام قائم کرنا چاہتے تھے۔

پاکستان میں زندگی کے وہی ڈھنگ اور اسلوب اختیار کریں جو اسلام تعلیمات کے مطابق ہیں اور نظام پاکستان کو صحیح اسلامی اور جمہوری خطوط پر چلائیں۔ سیاسی رہنماؤں کو چاہئے کہ اپنے ایجنڈے قائد کے رہنما اصولوں کے مطابق ڈھالیں اور منافقت کی سیاست ختم کریں۔

☆☆☆

اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے

اقبال اور معاشی انصاف کی تلاش

پروفیسر فتح محمد ملک

اقبال کی طویل نظم "لینن خُدا کے حضور میں" بڑی حد تک اقبال کی ممنوعہ شاعری میں شمار ہوتی ہے۔ یہ نظم قارئین ادب میں جتنی مقبول ہے نقادانِ ادب میں اتنی ہی غیر مقبول ہے۔ اس وقت تک اقبال کی طویل نظموں کی تفہیم و تحسین پر مشتمل دو قابلِ قدر کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک بھارت میں اور دوسری پاکستان میں۔ نامور نقاد پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی کتاب "اقبال کی تیرہ نظمیں" اقبال شناسی میں ایک عمدہ اضافہ ہے۔ ہمارے ہاں پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کی تصنیف "اقبال کی طویل نظمیں" اقبالیات کے طالب علموں میں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہیں۔ یہ بات بہت معنی خیز ہے کہ "لینن خُدا کے حضور میں" ہر دو کتابوں میں زیرِ بحث نہیں لائی گئی۔ ہمارے میڈیا کے خُداوند بھی اس عظیم نظم کے فیضان سے محروم چلے آرہے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا اس نظم سے اُتنا ہی ڈرتا ہے جتنا ہمارے خُداوندانِ مکتب اس سے خوف کھاتے ہیں۔ جو تین طویل نظمیں "بالِ جبریل" کی آبرو ہیں یہ نظم اُن میں سے ایک ہے۔ یادش بخیر، جس زمانے میں "بالِ جبریل" ایم اے اردو کے نصاب میں شامل تھی اُس زمانے میں بھی اس نظم کو ادبیاتِ اُردو کے نصاب سے باہر رکھنے کا اہتمام کرلیا گیا تھا۔

سوال یہ ہے کہ پاکستان میں تہذیب و سیاست کے اربابِ بست و کشاد مفکرِ پاکستان کی اسلامی انقلابی فکر سے پھوٹنے والی اس نظم کو عملاً سنسر شپ کی نذر کیوں کرتے چلے آرہے ہیں؟ جواب یہ ہے کہ ہمارا حکمران طبقہ معاشی انصاف کے اسلامی تصورات کو عوام کی نظروں سے چھپائے رکھنا چاہتا ہے۔ چونکہ یہ طبقہ معاشی انصاف کے اسلامی تصورات کو پاکستان میں نافذ نہیں کرنا چاہتا اس لیے وہ ان تصورات کی مقبولیت سے خائف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم اقبال کے ہاں معاشی عدل و انصاف کی تلاش کی کہانی اس نظم سے شروع کررہے ہیں۔

یہ نظم اُن دو تین نظموں میں سے ایک ہے جن میں اقبال کی شاعرانہ صناعی اپنے اوجِ کمال پر نظر آتی ہے۔ اس نظم کی فنی ساخت پرداخت بہت سوچ سمجھ کر کی گئی ہے۔ اس نیم ڈرامائی نظم کا جو تصوراتی ڈھانچہ تیار کیا گیا ہے وہ تین کرداروں کی گفتگو سے وجود میں آیا ہے۔ یہ تین کردار ہیں: لینن، فرشتے اور خُدا۔ وفات کے بعد لینن خُدا کی ہستی پر ایمان لے آتے ہیں اور خُدا کی بارگاہ میں اپنے عمل کا حساب پیش کرتے وقت اپنی دہریت پسندی پر ندامت کا اظہار کرتے ہیں۔ آیئے پہلے لینن کی زبانی ذاتِ باری کی حقانیت کا بیان سُنیں:

اے اَنفُس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات
میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات
محرم نہیں فطرت کے سرودِ ازلی سے
بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات
آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہُوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات

نظم کا یہ ابتدائی حصہ گویا توبہ کا باب ہے۔ لینن اپنی دہریت پسندی کی ذمہ داری بڑی حد تک مغرب کے سرمایہ داری نظام، اس نظام کے پروردہ علوم و فنون اور اس نظام کی کوکھ سے پیدا ہونے والے فرنگی استعمار پر ڈالتے ہیں۔ ہر دم بدلتے ہوئے نظریات سے عبارت بے خُدا تہذیب میں پنپتے ہوئے علوم کی

نارسائی کا یہ عالم ہے کہ:

یورپ میں بہت روشنیء علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمہ حیواں ہے یہ ظلمات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اُس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

ایک لادین تہذیب کی سائنس وٹیکنالوجی میں ترقی کا حاصل فقط ہلاکت آفرین ہتھیار ہیں۔فرنگی مدنیت نے اگر ایک طرف بے کاری وافلاس کو پروان چڑھایا ہے تو دوسری جانب عریانی اوراوباشی کو ایک پسندیدہ معاشرتی چلن بنا دیا ہے۔لینن حریمِ کبریا میں اس بے خُدا تہذیب کی غارتگری کے خلاف فریاد کرتا ہے:

اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات
جب تک میں جیا خیمہ افلاک کے نیچے
کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات
گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب رُوح کے اندر متلاطم ہوں خیالات
وہ کون سا آدم ہے کہ تُو جس کا ہے معبود
وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات؟
مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی
مغرب کے خُداوند درخشندہ فلزات

گویا دہریت کے فلسفے کو مغرب کی سرمایہ دارانہ تہذیب نے ہی جنم دیا ہے۔سرمایہ داری نظام نے خُدا کو دُنیا بھر سے عملاً بے دخل کر رکھا ہے۔مشرق کے محکوم اپنے فرنگی آقاؤں کی پرستش میں مصروف ہیں تو اہلِ فرنگ زر کی پرستش میں منہمک ہیں۔ایسے میں لینن خُدا سے یہ چبھتا ہوا سوال پوچھتے ہیں کہ وہ آدم کہاں ہے جو خُدا پرست ہو؟۔سرمایہ داری نظام نے لوگوں کو اپنے استحصالی چنگل میں یوں دبوچ رکھا ہے کہ وہ اپنے خالقِ اکبر تک کو بھول بیٹھے ہیں۔خُدا کی بارگاہ میں لینن کی یہ فریاد اُمید اور رجائیت پر آ تمام ہوتی ہے۔یہ رجائیت مغرب میں اشتراکیت کے ہاتھوں سرمایہ دارانہ نظام کی شکست کے آثار سے پیدا ہوئی ہے۔فریاد میں یک بہ یک نمودار ہو جانے والی اُمید کی تان بھی ایک سوال پر آ ٹوٹتی ہے۔وہ آتشیں سوال یہ ہے کہ روزِ مکافات کب آئے گا اور سرمایہ پرستی کا سفینہ کب ڈوبے گا؟

آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات
میخانے کی بُنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دُنیا ہے تری منتظر اے روزِ مکافات؟

بارگاہِ خُداوندی میں لینن کی فریاد کو فرشتے بھی چپکے چپکے مگر بڑے انہماک کے ساتھ سُن رہے تھے۔لینن کے اُٹھائے ہوئے درج بالا آخری سوال تک پہنچتے پہنچتے وہ اتنے جذباتی ہو گئے کہ انھوں نے بے ساختہ لینن کی ہم نوائی شروع کر دی۔نظم کا یہ حصہ فرشتوں کے گیت پر مشتمل ہے۔فرشتوں کے خیال میں خلقِ خُدا پر اس پیہم ظلم وستم کا بنیادی سبب یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی عشق کی گرمی سے محروم ہو کر رہ گئی ہے۔چنانچہ وہ اللہ میاں سے یوں ہمکلام ہوتے ہیں:

خلقِ خُدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی
دانش و دِین و علم و فن بندگی ہوس تمام
عشقِ گرہ کُشاے کا فیض نہیں ہے عام ابھی

فرشتے لینن کے نقطہ نظر کی پُرزور، مدلل اور مؤثر تائید کرتے وقت اس حقیقت کو بڑی خوبی کے ساتھ نمایاں کرتے ہیں کہ "رند وفقیہ ومیر و پیر" سبھی خلقِ خُدا پر جبر واستبداد کے پہاڑ توڑنے والوں ہی میں شامل ہو گئے ہیں۔گویا وہ

مذہب جو خلقِ خُدا کو جبر و استبداد سے نجات دلانے کے لیے آیا تھا اُسے اِن اداروں نے جبر واستبداد کا دستگیر اور خلقِ خُدا کا دشمن بنا کر رکھ دیا ہے۔"دانش و دین" اور "علم وفن" خُدا کی بندگی کی بجائے ہوس کی پوجا میں مشغول ہیں۔اب وقت آگیا ہے کہ عشق کی تلوار نیام سے باہر آئے اور خلقِ خُدا کو ظلم وستم اور جبر واستبداد سے نجات دلائے۔

یہ لینن اور فرشتوں کے فکر واظہار میں اس کامل ہم آہنگی ہی کا کرشمہ ہے کہ اللہ میاں فرشتوں کو حکم دیتے ہیں کہ وہ فی الفور دُنیا میں مروج سرمایہ دارانہ نظام کو مٹا کر زمین پر اللہ کی حاکمیت کا بول بالا کر دیں۔نظم کے اس تیسرے اور آخری حصے کا عنوان ہے:"فرمانِ خُدا،فرشتوں سے"۔

اُٹھو میری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
سلطانیء جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوش گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو
حق را بسجودے، صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مر مر کی سلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو
تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

یہ نظم اقبال کی اسلامی انقلابی آرزومندی کی دین ہے۔"یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے" کے مصداق اقبال کی یہ تمنا تھی کہ روسی اشتراکیت دہریت یعنی "لا" کی منزل سے آگے بڑھ کر اِلاّ اللہ کے مقام تک پہنچے۔سوال یہ ہے کہ اقبال روس کے اشتراکی انقلاب کو دورِ حاضر میں اسلام انقلاب کا ایک ناگزیر پیش خیمہ کیوں سمجھتے ہیں؟ اس سوال کا سرسری جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ سرمایہ دار یورپ نے قریب قریب ساری دُنیائے اسلام کو غلامی کے جال میں گرفتار کر رکھا تھا۔جن کے لیے فقط اللہ کی بندگی مقدر ہو چکی تھی اُن کا حکمران طبقہ فرنگ کی بندگی پر نازاں تھا۔ماہمہ عبدِ فرنگ آں عبدہٗ اور ماکلیسا دوست، مامسجد فروش۔یورپ کے اشتراکی انقلاب نے سرمایہ داری نظام کی خُدائی کے سامنے "لا" کا نعرہ بلند کر دیا تھا۔سرمایہ دارانہ استعمار کی خُداوی سے انکار نے مسلمانوں کے سامنے سامراجی غلامی سے انکار کا راستہ روشن کر دیا تھا۔مغرب میں سرمایہ داری اور اشتراکیت کے مابین کشمکش نے مغربی سامراج کو کمزور کر دیا تھا۔ایسے میں اقبال اپنے ارتقائی نقط؟ نظر کے ساتھ یہ سوچنے لگے تھے کہ روسی اشتراکیت سرمایہ داری نظام کے خاتمے کے بعد کسی روحانی مسلک کو اپنا لے گی۔یہ بات انھوں نے سرفرانسس ینگ ہسبنڈ کے نام اپنے کھلے خط میں بھی برملا کہی تھی کہ اشتراکی روس کے بارے میں یہ سوچ غلط ہے کہ وہ کبھی بھی کوئی روحانی مسلک نہ اپنائے گا۔انھوں نے اس خط میں دھمکی آمیز انداز میں سرفرانس کو بتایا تھا کہ جب اشتراکیت خدا پر ایمان لے آئے گی تب اسلام کے بہت قریب آ جائے گی۔چنانچہ اقبال سرمایہ دارانہ استعمار کی شکست وریخت میں اشتراکی روس کے کردار کو اسلامی انقلاب کا اوّلین مرحلہ سمجھتے تھے۔

اقبال کی اس آرزومندی کو فلسفیانہ انداز میں سمجھنا ہو تو ہمیں اقبال کی کتاب "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" کا وہ باب پڑھنا چاہیے جس میں کلمہ طیبہ کی تفسیر کی گئی ہے۔لا الہ الا اللہ کے زیرِ عنوان اقبال لا اور اِلاّ کو نفی اور اثبات کی دو منزلیں قرار دیتے ہیں۔جھوٹے خُداؤں کی نفی کے بغیر سچے خُدا کا اثبات ناممکن ہے۔اشتراکی روس نے فرنگی تہذیب کے اندر بندگی اور خواجگی کے درمیان جنگ برپا کر دی تھی۔اقبال نے سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان اس جنگ کے احوال ومقامات "پیامِ مشرق" میں پیش کیے ہیں۔یوں تو انھوں نے فلسفی اور مزدور، موسیولینن اور قیصر ولیم، نوائے مزدور کی سی نظموں میں اس جنگ کی مصوری متعدد حسین پیرایہ ہائے بیان میں کی ہے مگر نظم "قسمت نامِ سرمایہ دار ومزدور" دُنیائے ادب میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔اس مختصر نظم میں اقبال مزدور کی سادہ لوحی اور سرمایہ دار کی عیاری کو خوبصورت طنزیہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔

اس تقسیم میں سرمایہ دار نے تمام تر مادی وسائل تو اپنے حصے میں رکھ لیے اور سارے کے سارے روحانی خواب وخیال مزدور کی جھولی میں ڈال دیے۔قرآن کریم کے معاشی تصورات کی روشنی میں جب وہ یورپ میں برپا سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش کا مطالعہ کرتے ہیں تو انھیں قرآن مزدور کا دستگیر دکھائی دیتا ہے۔"بانگِ درا" کی ایک چھوٹی سی نظم میں وہ کہتے ہیں:

کارخانے کا ہے مالک مردکِ ناکردہ کار
عیش کا پُتلا ہے، محنت ہے اسے ناسازگار
حکم حق ہے لیس الانسان الاّ ما سعیٰ
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

سرمایہ دار اور ممدور کے اس قسمت نامہ پر اقبال کے ابلیس کا یاد آ جانا قدرتی سی بات ہے۔ اپنی مجلسِ شوریٰ کے اجلاس سے افتتاحی کلمات میں ابلیس اپنے اس کارنامے پر بھی ناز کرتا ہے کہ ناداروں کو اُسی نے تقدیر کا سبق پڑھایا ہے اور سرمایہ داروں کو اُسی نے سرمایہ داری کے جنوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اقبال سمجھتے تھے کہ اشتراکیت نے یورپ میں جہاں بندہ مزدور کو اپنا مقدر خود سنوارنے کا درس دیا ہے وہاں مزدوروں کو سرمایہ داری نظام کے خالق و مالک ابلیس کے سامنے "لا" کا نعرہ بلند کرنے کا حوصلہ بھی بخشا ہے۔ ابلیسی نظام کی نفی خُدائے واحد کی تلاش کا اوّلیں مرحلہ ہے۔

زندگی کی جدلیات میں نفی اور اثبات کی کارفرمائی کو اپنے فلسفیانہ دینی شعور کی روشنی میں پیش کرتے وقت اقبال نے مسلمانوں کو اس قرآنی حکمت کو سمجھنے کا مشورہ دیا ہے کہ سچی توحید پرستی اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک شہنشاہیت، پاپائیت اور دیگر جھوٹے خُداؤں کے بُت پاش پاش نہ کر دیئے جائیں۔ اشتراکی روس نے دُنیائے انسانیت کو لاسلاطیں، لاکلیسا، لا الہٰ کی منزلوں پر پہنچا کر تمام جھوٹے خُداؤں کی نفی کر دی ہے۔ اب اثبات یعنی اللہ کی خُدائی پر ایمان لانے کا مرحلہ باقی ہے۔ چنانچہ وہ اشتراکی روس کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنے رہوار کو ایک بار پھر ایڑ لگائے اور اِلاّ اللہ کی منزل پر آ پہنچے۔ اقبال یہ مشورہ چند سال پیشتر اپنی عہد آفریں تخلیق "جاوید نامہ" میں بھی پیش کر چکے ہیں۔

"جاوید نامہ" کے فلکِ عطارد پر مولانا جلال الدین رومی کی معیت میں اقبال سیّد جمال الدین افغانی سے ملاقات کرتے اور دُنیائے اسلام کو درپیش بحرانی صورتِ حال پر تبادل خیال کرتے ہیں۔ سیّد جمال الدین افغانی اقبال کی وساطت سے اشتراکی روس کے رہنماؤں کو ایک پیغام بھجواتے ہیں۔ اس پیغام کا لب لباب بھی یہی ہے کہ اگر اشتراکی انقلاب نفی کی منزل پر ہی رُک کر رہ گیا تو اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو اس سے پہلے اسلامی انقلاب کا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ اشتراکی روس کو یہ پیغام بھجواتے ہیں کہ وہ مسلمان قوم کی سرگزشت سے عبرت حاصل کرے۔ اپنی تقدیر کو اقوامِ مشرق کے ساتھ وابستہ کرے اور مغرب سے اٹھنے والے نئے فتنوں سے ہوشیار رہے۔ مغرب کے اُس پُرانے بت کدے کی طرف نہ دیکھے جس کے باطل خُداووں کا کام خود اُس نے تمام کر دیا ہے۔ اب وقت ہے کہ وہ "لا" کے مقام سے "اِلاّ" کی جانب اپنے سفر کا آغاز کرے۔ جب اشتراکی روس لا سے اِلاّ کی جانب اپنا رختِ سفر باندھے گا تو اُسے قرآن کریم کی روشنی کی ضرورت پڑے گی۔ جمال الدین افغانی اپنے پیغام میں قرآن کریم سے روشنی لینے کی اہمیت واضح کرتے ہوئے اشتراکی روس کو بتاتے ہیں کہ حکمتِ قرآنی ابھی تک پوری طرح بروئے کار نہیں آ سکی۔ اب وقت ہے کہ اس حکمت کو ایک سچے انقلابی پروگرام میں ڈھالا جائے تاکہ انسان کی تاریک رات ختم ہو اور ایک نئی، تابندہ اور پائندہ تر صبح طلوع ہو سکے۔

عہدِ حاضر کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اشتراکی روس نے نہ تو اپنے مقدر کو مشرق سے وابستہ کیا اور نہ ہی ترکِ فرنگ پر آمادہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ کہ ردِ انقلاب کی تباہی سے دوچار ہو کر اُسی سرمایہ داری نظام کی چاکری پر مجبور کر دیا گیا جس کے خلاف ردِ عمل کے طور پر کارل مارکس نے اشتراکیت کا فلسفہ پیش کیا تھا۔ اسی اشتراکی فلسفے کو ایک انقلابی سیاسی پروگرام کی شکل دے کر لینن کی قیادت میں روس میں انقلاب برپا ہوا تھا۔ اقبال نے اس انقلاب سے یہ اُمید باندھی تھی کہ یہ انقلاب دوبارہ سرمایہ داری کے شکم کا ایندھن بننے کی بجائے نفی سے اثبات کی منزل کی طرف گامزن ہوگا۔ حقیقت کی دُنیا میں تو یہ اُمید پوری نہ ہو سکی مگر اقبال نے لینن کو خُدا کے حضور پیش کر کے خواب وخیال کی دُنیا میں اشتراکی انقلاب کو اسلامی انقلاب کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے دکھا دیا۔ چنانچہ اقبال کی نظم بارگاہِ خداوندی میں لینن کی وکالت اس شان کے ساتھ کرتی ہے کہ فرشتے اُس کے ہمنوا بن جاتے ہیں اور اللہ میاں فرشتوں کو اسلام کے انقلابی معاشی تصورات کے نفاذ کا فرمان جاری کر دیتے ہیں۔

ہمارے حکمران طبقہ نے اب تک خُدا کے فرمان پر سرے سے غور ہی نہیں کیا۔ اس فرمان کی ایک ایک شق نفاذ طلب ہے۔ اس فرمان کا نفاذ مخصوص مفادات کے حامل جن طبقات کے لیے یومِ حساب کا حکم رکھتا ہے اُن کے ذوق اور ذہنیت سے اگر اقبال بخوبی آگاہ ہیں تو اللہ میاں اُن سے ناامید ہیں۔ چنانچہ فرشتوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ دُنیا کے غریبوں کو جگا دیں، غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے گرما دیں، پیرانِ حرم کو حرم سے نکال باہر کریں، خالق ومخلوق کے درمیان حائل پیری، مُلاّئی اور سلطانی کے پردے اُٹھا دیں تاکہ غریب اور مظلوم خلقِ خُدا امیروں کے محلات کے درودیوار کو ہلا کر رکھ دے اور یوں دُنیا میں معاشی انصاف کا بول بالا ہو۔

علامہ اقبال نے کسان کو جاگیردار اور مزدور کو سرمایہ دار کے پنجہ ظلم سے آزاد کرانے اور قرض کے شکنجے سے رہا کرانے کی خاطر شعر وحکمت اور سیاست و معیشت، ہردو، سے خوب کام لیا ہے۔ اس باب میں انھوں نے ایسی ایسی چونکا دینے والی باتیں کر رکھی ہیں جو نہ تو اُن سے پہلے اور نہ ہی اُن کے بعد کسی کو کہنے کی جُرأت ہوئی ہے۔ مثلاً یہی دیکھیے کہ اُنھوں نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے ۳۲ء کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے یہ تک کہہ دیا تھا کہ برصغیر میں اسلام کا مستقبل مسلمان کسان کی آزادی پر منحصر ہے۔ انھوں نے مسلمان نوجوانوں کی قوتِ عمل کو مہمیز دیتے ہوئے ملک بھر میں یوتھ لیگز اور کلچر سنٹر کے قیام کا مشورہ دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ یہ یوتھ لیگز۔

"اپنی تمام تر توجہ خدمتِ خلق، اصلاحِ رسومات اور قصبوں اور دیہات میں اقتصادی پروپیگنڈے پر صرف کریں۔ اب حالات ۵۲ء کے چین کی طرح ناگوار صورت اختیار کر چکے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ نوجوانوں کی یہ جماعتیں خوب اقتصادی پروپیگنڈہ کریں اور کسانوں کو زمینداروں کے پھندوں سے نجات دلانے کی کوشش کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں اسلام کے مستقبل کا انحصار مسلمان کاشتکار کی آزادی پر ہے۔ آیئے شباب کی آگ کو ایمان کی آگ میں حل کر ڈالیں تاکہ ہم آنے والی نسلوں کے لیے عمل کی ایک نئی دُنیا تخلیق کر سکیں"۔

اس مقصد کے حصول کی خاطر علامہ اقبال نے اپنی شاعری سے دو کام لیے ہیں۔ اوّل یہ کہ انھوں نے اپنی شاعری میں کسان اور مزدور کی غلامی اور مظلومیت کا دردناک نقشہ پیش کیا ہے۔ میں اس کی مثال میں اُن کے فقط دو ایک شعر پیش کرنا کافی سمجھتا ہوں:

دہقاں ہے کسی قبر کا اُگلا ہوا مردہ
بوسیدہ کفن اُس کا ابھی زیرِ زمیں ہے
خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے دہ خدایاں کشت دھقاناں خراب
انقلاب اے انقلاب!

اور دوم یہ کہ انھوں نے اپنی شاعری کے جادو سے کسان اور مزدور کو خوابِ غفلت سے جگا کر جاگیردار اور سرمایہ دار کے خلاف بغاوت کا درس دیا ہے۔ انھوں نے غریبوں اور مظلوموں کو مختلف اور متنوع انداز میں یہ بات بتائی ہے کہ اب اُس کی رات ختم ہونے کو آ رہی ہے، اُفق پر سپیدہ سحر نمودار ہونے کو ہے ضرورت فقط اس بات کی ہے کہ وہ سحر کی آذان سُنیں اور خود کو ظلم وستم سے آزاد کرنے کی جدوجہد کا آغاز کریں۔

اپنی وفات سے صرف دوسال پیشتر اپنی معرکتہ الاراء کتاب: پس چہ باید کرد اے اقوام شرق، میں انھوں نے مستقبل کے نوآزاد مشرق کی تعمیر نو کی بنیادیں فراہم کر دی تھیں۔ کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ وہ اقوامِ مشرق کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سیاسی آزادی کے حصول کے فوراً بعد انھیں اس سیاسی آزادی کو اقتصادی اور تہذیبی آزادی بنانے کا چیلنج درپیش ہوگا۔ اس کتاب میں انھوں نے بتایا ہے کہ آزاد مشرق کو کیا کرنا چاہیے؟ اس اعتبار سے اُن کا یہ مجموعہ کلام مشرق کی کامل آزادی کا ایک انقلابی منشور ہے۔

اقبال اقوامِ مشرق کو مغربی استعمار کی قید سے رہائی کی جو تدبیریں بتاتے ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ مشرق کی قوموں کو مغرب کی بالواسطہ غلامی یعنی مغربی دُنیا کی نواستعماری پالیسیوں سے خبردار رہنا ہوگا۔ آج کی دُنیا میں سات سمندر پار بیٹھ کر ریموٹ کنٹرول سے آزاد مشرقی اقوام کی سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی غلامی کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے مشرق کی قوموں کو فرنگ یعنی مغربی سامراج کے ہتھکنڈوں سے باخبر رہنا ہوگا۔ اقبال کے نزدیک عہدِ حاضر میں سیاست سوداگری بن کر رہ گئی ہے۔ تختہ دُکاں شریکِ تخت وتاج۔ دُکان کا تھڑا ہی تختِ شاہی بن کر رہ گیا ہے۔ مغربی استعمار کی اصل قوت سوداگری میں پنہاں ہے۔ اس لیے اقوامِ مشرق کو چاہیے کہ وہ خود اپنے وسائل پر انحصار کریں۔

آج ہمارے اقتصادی منصوبہ سازوں کو ایک نظر علامہ اقبال کی پہلی کتاب "علم الاقتصاد" پر بھی ڈال لینی چاہیے اور اقبال کے آخری شعری کارناموں میں سے "پس چہ باید کرد" میں پوشیدہ حکمت اور حکمتِ عملی پر بھی بار بار غور کرنا چاہیے۔ اقبال نے آج سے ایک صدی پیشتر لکھا تھا کہ تعلیم اور اقتصادی ترقی لازم وملزوم ہیں۔ اقبال کے خیال میں جب تک تعلیم عام نہ ہوگی تب تک اقتصادی ترقی کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اسی طرح اقبال نے آبادی کی منصوبہ بندی کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے شادی بیاہ اور اُس سے متعلق خاندانی رسوم کی اصلاح کو بھی وقت کی اہم ترین ضرورت قرار دیا تھا۔ اقبال نے اپنی شاعری اور اپنی فلسفیانہ تحریروں میں عمر بھر نہ صرف معاشی ظلم کے خلاف احتجاج کیا ہے بلکہ اس ظلم کو مٹا کر معاشی انصاف کے ایک نئے نظام کے قیام کی بنیادیں بھی فراہم کی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آج ہم اقبال کے تصورات کو پاکستان میں ایک عادلانہ معاشی نظام کے نفاذ کی بنیاد بنائیں۔

☆☆☆

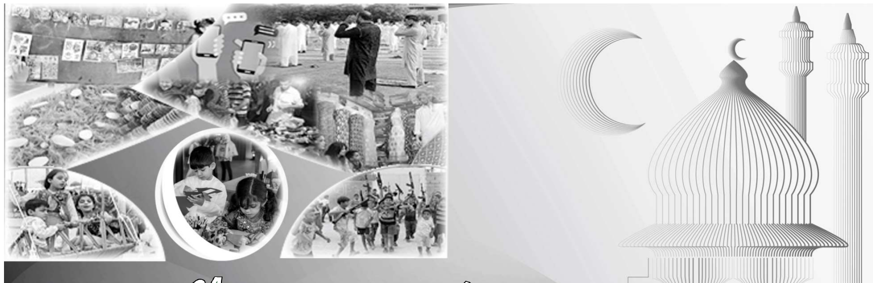

ماہ رمضان اور عید سے جڑی چند یادیں

نعیم فاطمہ علوی ایگزیکٹو ممبر آف گرلز گائیڈ ایسوسی ایشن

تاروں بھری رات کے وہ لمحات جب نیند میری پلکوں سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے آسمان پر تارے گن رہی تھی۔ مجھے بچپن کی یادوں نے اپنی نرم گرم گود میں لے کر آنچل کی اوٹ میں چھپالیا۔ میں پل بھر میں سالوں کی مسافت طے کر کے وہاں پہنچ گئی جہاں میرا بچپن بے فکری سے لُڈیاں ڈالتا پھرتا تھا۔ میرا آج اُس مسکن میں گرد جھاڑ کر صاف وشفاف موسم کی خوشبو سے معطر ہو رہا تھا۔ کتنی خوش کن بات ہے کہ میں اپنی زندگی کے تیسرے دور کے مزے اڑا رہی ہوں۔

آج میرا بچپن اور جوانی اپنی رنگا رنگ بہار دکھا کر چکے سے مجھے اس موڑ پر لے آئے ہیں جہاں میں نانی دادی بن کر زندگی کی گھما گھمی کو ایک اور ہی رنگ ڈھنگ سے دیکھ رہی ہوں۔ میں نے رُتوں کو بدلتے اور نوجوان نسلوں کو پیدا ہو کر جوان ہوتے دیکھا ہے۔

یوں تو ہر زمانہ ہی اچھا ہوتا ہے بشرطیکہ اس زمانے کی نسل زمین سے جڑی ہوئی ہو۔ اپنی تہذیب و تمدن سے آگاہ ہو۔ اپنی روایات سے اغماض نہ برتے۔ زمانہ تبدیل تو ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔

اب دیکھیئے ناں! ہمارے اور ہمارے بچوں کے زمانے میں بہت فرق ہے ہمارے زمانے میں بچوں کی عزت نفس کا کوئی خاص خیال نہیں رکھا جاتا تھا ہم نے اپنے بچوں کی عزت نفس کی خوب نشو ونما کی۔ بقول اقبالؒ "خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے" اچھے بُرے کی بحث کو مدنظر رکھے بغیر نتائج ہمارے سامنے ہیں۔

خوشی کشید کرنے کے عناصر انتظار، تشنگی، جستجو، صبر اور شمولیت نہ ہوں تو خوشی کا تصور ادھورا اور سطحی سا ہی رہ جاتا ہے۔

بچپن جوانی اور موجودہ زمانہ جو ہم بسر کر رہے ہیں کے روزن زندگی سے جھانک کر دیکھیں تو رمضان اور عید کی خوشگوار یادیں لپٹ لپٹ کر میری تصوراتی زندگی کو ہرا بھرا کر دیتی ہیں۔

میرے والد محکمہ انہار میں اوورسیئر تھے لہٰذا شہروں سے دور میرا بچپن محکمہ انہار کے بنگلوں میں گزرا۔ گھر تو اتنے بڑے نہیں ہوتے تھے مگر گھروں کے ارد گرد زمین بہت ہوتی تھی۔ برآمدہ، برآمدے سے ملحقہ بیٹھک اور پھر اسی لائن میں دو بیڈروم بیڈروم کے آگے لمبا برآمدہ برآمدے کے ایک کونے کی طرف کچن اور دوسرے کونے کی طرف سٹور ہوتا تھا اور اس برآمدے کے سامنے بڑا سا صحن اور صحن سے دروازہ حویلی میں کھلتا تھا۔ میری والدہ اور میرے دونوں بھائیوں کو جانوروں کا بہت شوق تھا حویلی میں مرغیوں بھینسوں اور بکریوں کے ساتھ ساتھ دو اعلیٰ نسلوں کے کتے بھی ہوتے تھے۔ میرے بھائیوں کو کتے رکھنے کا بہت شوق تھا۔ والدہ کے جانور پالنے کے شوق کی وجہ سے بڑی عید پر قربانی بھی گھر میں پلنے والے جانوروں ہی کی دی جاتی تھی۔ میں اور میرے والد البتہ اس شوق سے کوسوں دور تھے۔

میری امی بہت عبادت گزار تھیں۔ شام کو پوری بیس تراویح خشوع و خضوع سے ادا کرتی تھیں۔ کچھ گھنٹے سونے کے بعد صبح تہجد کے لیے اُٹھ جاتیں، تہجد کی نماز کے علاوہ بھی بہت سے نوافل ادا کیا کرتی تھیں۔ جو مختلف مقاصد کے لیے ہوتے مثلاً کچھ قبر میں آسانیاں پیدا کرنے کے لیے، کچھ قبر میں روشنی کے

لیے، کچھ منکر نکیر کے سوال و جواب میں آسانی کے لیے، اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ان کی قبر کو اپنے نور کی روشنی عطا فرمائے۔ آمین

ہمارے گھر میں پندرہ بیس کلو خالص دودھ کا ہونا تو معمول تھا۔ نوافل ادا کرنے کے بعد امی چاٹی میں دہی ڈال کر ہاتھ کی مدھانی سے رِڑکنا شروع کر دیتیں ابھی یہ سلسلہ چل ہی رہا ہوتا تھا کہ گھر سے باہر لسی لینے والوں کی لائن لگ جاتی۔ امی جوڑوں کی تکلیف کے باعث گھر میں کوئی نہ کوئی مددگار ضرور رکھتی تھیں۔ اگر مددگار چھٹی پر چلا جاتا تو یہ ڈیوٹی میرے بھائی کی ہوا کرتی تھی۔ وہ بہت شریف النفس تھا جو امی کہتیں، کرتا رہتا کبھی کبھار کسی وجہ سے مجھے بھی یہ دشوار گزار کام کرنا پڑتا۔ میری نیند بہت پکی تھی نیند سے بیدار ہونے پر میرا غصہ مدھانی کے ساتھ ساتھ دودھ پر تیرتے مکھن کی طرح یوں رقص کرتا کہ امی کو ڈانٹنا پڑتا اور ڈانٹتے ہوئے وہ یہ بھی کہتیں ایسی بدبخت ہے میری ساری عبادت ضائع کرا دیتی ہے۔

امی اس وقت سحری بھی بناتیں اور ساتھ بے شمار لوگوں کو لسی دہی اور کسی کسی کو لسی میں مکھن بھی رکھ کر دیتی جاتیں۔ ہمیں یہ حکم ہوتا تھا کہ کوئی دروازے سے خالی نہ جائے۔

عصر کی اذان کے ساتھ ہی افطاری کی تیاری شروع ہو جایا کرتی تھی۔

ہمارے گھر میں رمضان سے پہلے رمضان کی تیاری پر بھی بہت توجہ دی جاتی تھی۔ میرے ابو چاہتے تھے کہ روزہ کھجور سے کھول کر کھانا کھایا جائے مگر میری امی نے خالص بیسن اور خالص سرسوں کا تیل جو رمضان کے لیے بنوا کے رکھا ہوتا تھا وہ کیسے رائیگاں جانے دیتیں۔ امی بڑے اہتمام سے افطاری بنایا کرتی تھیں جس پر بسا اوقات ابو اپنے حکم کی تعمیل نہ ہونے پر ناراض بھی ہوتے مگر زندگی بھر ابو ناقد اور امی تخلیق کار ہی رہیں۔ ہم نے ہمیشہ ابو کو ہار مانتے ہی دیکھا۔

مغرب کے بعد ایک سائرن کی آواز سے روزہ کھولا جاتا۔ روزے سے پہلے بے شمار لوگ دودھ، دہی اور دیسی گھی لینے بھی آجایا کرتے تھے۔ ہمارے گھر امی کے جہیز کے تانبے کے برتن ہوا کرتے تھے جنہیں سال میں ایک دفعہ قلعی کروایا جاتا تھا وہ گلاس بھی تقریباً آدھ کلو کا تو ہوتا ہوگا۔ جو بھی دودھ لینے آتا اسے وہ گلاس بھر کر دے دیا جاتا۔ یہ سلسلہ روزہ کشاء تک چلتا رہتا اور امی کبھی بھی رزق تقسیم کرتے ہوئے نہ تھکتیں تھیں۔ رمضان میں تو خاص طور پر وہ سخی ہو جایا کرتیں۔ ان کا یقین تھا کہ ثواب کی تعداد اصل زر سے دگنی ہو جاتی ہے۔ اگر اڑوس پڑوس سے کوئی چیز آجاتی تو خالی پلیٹ واپس نہیں جایا کرتی تھی۔

رمضان کا ایک ایک عشرہ الگ الگ فضیلت کے حوالے سے امی کو یاد ہوتا اور اسے اسی اہتمام سے گزارا کرتیں تھیں جو سب گھر والوں پر بھی اثر انداز ہوتا۔ مجھے بچپن سے ہی بھوکا رہنے سے بہت خوف آتا تھا لہٰذا میرے لیے رمضان بہت مشکل گزرتا تھا میں ہر روز دن ڈھلتے ہی دعائیں مانگا کرتی تھی کہ یا خدا یہ روزہ قبول کرا اور مجھے باقی روزوں کے لیے معاف کر دے۔

اگلے دن سحری کے وقت جب میں روزہ نہ رکھنے کا ارادہ کرتی میری امی اور میرا بھائی حدیثیں سنا سنا کر مجھے اور میرے ضمیر کو وہ کچوکے لگاتے کہ مجھے روزہ رکھنا ہی پڑتا۔ یوں رو دھو کر میرے بھی روزے پورے ہو جاتے تھے۔

آخری عشرے میں امی قرآن ختم کرتیں اور ساتھ ہی چھوٹی چھوٹی شیریں بوندیاں منگوا کر بانٹی جاتیں۔

رمضان کے آخری عشرے میں امی کا بس نہیں چلتا تھا کہ ثواب کی ایک ایک بوند جمع کر کے کیسے اپنا دامن بھر لیں۔ آخری عشرے میں امی عید پیکٹ بھی بناتی تھیں جو دوستوں کے گھر جاتے تھے جس میں سویّاں، چینی، مہندی اور پھینیاں وغیرہ ہوتی تھیں۔

میں نے قرآن امی سے ہی پڑھا تھا لہٰذا امی مجھے روزانہ اور خاص طور پر رمضان میں قرآن کی اتنی تلاوت کروایا کرتی تھیں کہ مجھے کئی صورتیں اس زمانے

> ماں کی ممتا باپ کی شفقت اور رِیت رواج تو وہی ہیں بس اب جھٹ پٹ کا زمانہ ہے طور طریقوں میں تھوڑی تبدیلی آگئی ہے۔ جوان نسل کی اپنی سوچ ہے ہماری اپنی سوچ ہوا کرتی تھی۔ ہم تو خیر اپنی اس زندگی پر بھی اللہ کا ہزار بار شکر ادا کرتے ہیں۔

میں ہی ازبر ہو گئیں تھیں جو آج تک یاد ہیں۔

یہ تو تھا رمضان اب عید کے حوالے سے بھی سن لیجئے۔

ہمارے زمانے میں عید سے کچھ مہینے پہلے خریداری بند کر دی جاتی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ اب جو کچھ ملے گا عید پر ہی ملے گا۔ پھر عید پر نئے سوٹ، جوتے، جیولری، چوڑیاں، مہندی کی خوشی کئی گنا بڑھ جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ تربیت بھی ہو جاتی تھی کہ من پسند خوشیوں کے حصول کے لیے صبر کے دشوار گزار راستے سے گزرنا پڑے گا۔ عید سے ایک رات پہلے عید کی خوشی میں نیند نہیں آتی تھی۔ بار بار جوتوں کپڑوں کو دیکھنا، مہندی لگوانا اور پھر کپڑے پہن کر ہمسائیوں کو عید دکھانے جانا عیدی وصول کرنا اور پھر اس عیدی سے من پسند چیزیں خریدنا یہ سب خوشیاں عید کے ساتھ وابستہ تھیں۔

بچپن کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ ہم شہر سے بہت دور رہتے تھے امی نے میری سب چیزیں تیار کر دیں مگر چوڑیاں نہ خرید سکیں۔ میں نے تو عید سے ایک دن پہلے شور مچا دیا کہ چوڑیوں کے بغیر میری تو عید ہی نہیں ہوگی۔ میں نئے کپڑے بھی نہیں پہنوں گی۔ میرے والد کو معلوم ہوا تو انہوں نے اسی وقت ایک بندہ کئی میل دور بھیجا کہ میری بیٹی کے لیے کہیں سے بھی چوڑیاں خرید کر لاؤ۔ سو وہ بندہ اس پروجیکٹ پر روانہ ہو گیا میری چوڑیاں آئیں تو میں نے اگلے دن عید منائی۔ سسرال آئی تو ماں بن کر بچوں کی خوشیوں میں ہی سانس لیتی زندگی میں اپنی بیٹی کے ساتھ بہت پر لطف زندگی گزاری۔

اب نئی نسل میں میری بیٹی بھی اپنی بیٹی کے خوب نخرے اٹھاتی ہے۔ اب وہ اپنے آپ کو تو بھول ہی گئی ہے۔ بیٹی ہی اس کی زندگی کا محور و مرکز ہے۔ ماں کی ممتا باپ کی شفقت اور رِیت رواج تو وہی ہیں بس اب جھٹ پٹ کا زمانہ ہے طور طریقوں میں تھوڑی تبدیلی آ گئی ہے۔ جوان نسل کی اپنی سوچ ہے ہماری اپنی سوچ ہوا کرتی تھی۔ ہم تو خیر اپنی اس زندگی پر بھی اللہ کا ہزار بار شکر ادا کرتے ہیں۔ زندگی کا یہ دور بھی خوبصورت ہے۔ فراغت آسانیاں اور خوشیاں تقسیم کرنے کے بہتر مواقع کیونکہ خوشیاں ہمیشہ بانٹنے سے ملتی ہیں۔ زندگی کا حسن تو مثبت سوچ کا مرہون منت ہوتا ہے۔ مثبت طریقہ زندگی ہر دور کو خوبصورت بنا دیتا ہے۔ جانتی ہوں کہ میں جب بھی بچپن کی اس میٹھی اور پر لطف یادوں کی جھلمل سے نکلی تو وقت۔ کبھی میرے اس سجل سویرے سجن لمحوں کو نہیں لوٹا سکے گا۔

☆☆☆

بقیہ صفحہ 26

جو نہ ہوئی مکہ میں میسر اور نہ مدینے ہی میں ملی
آئے بہشتی مقبرہ والے لے کے یہ دولت لندن سے

پاکستان بننے کے بعد 1949ء میں زندہ دلانِ لاہور نے اردو کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی ہال میں اس قندیل ارتقا کا آخری خطاب سنا۔ جس کی لو دن بدن مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ عزم و ہمت، نحیف و نڈھال ہو چکا تھا جس نے باطل کا سحر سامری پاش پاش کیا تھا۔ جس نے اپنی خطابت اور صحافت سے عظمتوں کے چراغ فروزاں کئے تھے۔ جو ہمیشہ ہنود و فرنگ کے لئے کوہ گراں تھا۔ طلبہ نے ہال میں شور قیامت اٹھا رکھا تھا۔ مولانا نے فرمایا" کبھی ہم تماشائی تھے اور دنیا تماشا۔ اب ہم تماشا ہیں اور دنیا تماشائی۔ جہاں چڑھتے سورج کی پوجا ہو وہاں ڈوبتے سورج کو کون دیکھتا ہے"۔ ہال میں سناٹا چھا گیا۔ آپ نے اپنے خطاب کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا" ہمارا قافلہ منزل مقصود تک پہنچ چکا ہے۔ اگرچہ تمنائے راہ پیمائی باقی ہے مگر قوت راہ پیمائی نہیں۔ ان لوگوں کو دیکھتے ہیں جو عہد ماضی کی یادگار جان کر ہمیں تماشا سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو تماشائی"۔

ان الفاظ پر اپنے ملک عزیز کے قیام کے بعد کے حالات و واقعات پر نظر ڈالتے ہیں تو آنکھیں شرم سے جھک جاتی ہیں۔ اس ہوش ربا حقیقت سے نظر چرانے کے لئے بہتر یہی ہے کہ ہم اپنے ایمان کی ناتوانائی جس نے ملک خداداد کو ناتواں کر دیا ہے کا ذکر نہ ہی کریں اور اس موقع پر وہ اشعار یاد آرہے ہیں جو سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مختار مسعود کی آٹوگراف بُک میں لکھے اور انہوں نے آواز دوست میں ان اشعار کو اپنے مضمون کے نکتہ عروج پر جگہ دی۔

وہ اٹھتا ہوا اک دھواں اول اول
وہ بجھتی ہوئی چنگاریاں آخر آخر
قیامت کا طوفان صحرا میں اول
غبار راہ کاروان آخر آخر
چمن میں عنادل کا مسجود اول
اور گیاہ گلر خان آخر آخر

ملت اسلامیہ کا فرزند جلیل، آسمان صحافت وخطابت کا یہ درخشندہ آفتاب، ملت اسلامیہ کا بطل حریت، عاشق رسولؐ، بے باک و نڈر جرنیل 27 نومبر 1956ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا اور گوجرانوالہ کے گاؤں کرم آباد میں ابدی نیند سو گیا۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب صابر

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

بانی چیئرمین نظریہ پاکستان کونسل (ٹرسٹ) زاہد ملک پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب صابر کی صلاحیتوں کے معترف رہے۔ نظریہ پاکستان کونسل اسلام آباد میں انھیں کئی عہدوں پر کام کرنے کا موقع ملتا رہا۔ سن 2010ء سے تادم مرگ نظریۂ پاکستان کونسل (ٹرسٹ) اسلام آباد کی ایگزیکٹو کمیٹی کے ممبر رہے۔ دو کتابچے "نظریۂ پاکستان 2012ء" اور "پاکستان میں غیر مسلموں کے حقوق 2019ء" میں نظریہ پاکستان کونسل (ٹرسٹ) اسلام آباد کے زیرِ اہتمام شائع کیے۔

عالمی شہرت یافتہ ماہر اقبالیات، ماہر تعلیم، تجزیہ نگار، محقق، دانشور، انسان دوست، مفسر، قائداعظم شناس، مقرر پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر (تمغہ امتیاز، تمغہ برائے حسن کارکردگی) 17 نومبر 2022ء بروز جمعرات داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ نمازِ جنازہ آرمی قبرستان راولپنڈی میں ادا کی گئی۔ والد گرامی مرزا محمد ایوب 18 مارچ 1982ء اور والدہ محترمہ 2004ء کو مجھے تنہا چھوڑ گئے تھے۔ ماں باپ کی شفقت سے محرومیت کا احساس دامن گیر تھا کہ ڈاکٹر ایوب صابر کی محبتوں نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ روزانہ تہجد کے وقت اور سونے سے پہلے انہیں دعائیہ SMS کرنا میرے معمولاتِ زندگی میں شامل تھا۔ تقریباً ہر دوسرے دن شام پانچ بجے ان سے ٹیلی فون پر بات ہوتی۔

ڈاکٹر ایوب صابر گوناگوں خوبیوں کے حامل تھے۔ 30 دسمبر 2002ء کو پنجاب یونیورسٹی لاہور کے سالانہ کانووکیشن میں ہم نے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں وصول کیں۔ عجب اتفاق ہے کہ ہم دونوں کے نگران ممتاز محقق، ماہر اقبالیات اور ماہر تعلیم ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی تھے۔ ڈاکٹر ایوب صابر کی اقبال شناسی کو شہرت دوام ان کی کتاب "اقبال دشمنی" سے ملی۔ وائس چانسلر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ڈاکٹر نذیر احمد سانگی نے 23 دسمبر 2013ء کو قائداعظم شناسی کے حوالہ سے ایک قومی کانفرنس کا انعقاد کروایا۔ دیگر قومی سطح کے دانشوروں میں ڈاکٹر ایوب صابر بھی اسٹیج کی زینت تھے۔ میری کتاب "اقبال کے گوہر شہوار" میں ڈاکٹر ایوب صابر کے فکر و فن کا تذکرہ بھی شامل تھا۔ انھوں نے اس تبصرے پر نہ صرف شکریہ ادا کیا بلکہ اپنی دیگر کتب بھی کانفرنس کے تیسرے حصے میں مجھے عنایت کیں۔ نظریہ پاکستان کونسل اسلام آباد میں انھیں کئی عہدوں پر کام کرنے کا موقع ملتا رہا۔ بانی چیئرمین نظریہ پاکستان کونسل زاہد ملک ان کی صلاحیتوں کے معترف رہے۔ ڈاکٹر ایوب صابر کی حوصلہ افزائی سے مجھے بہت سی قومی تقریبات میں شرکت کا موقع ملتا رہا۔ جب بھی اسلام آباد جانے کا موقع ملتا، ڈاکٹر ایوب صابر مجھے اکادمی ادبیات، ادارہ فروغ اردو، نیشنل بک فاؤنڈیشن اور نظریہ پاکستان کونسل کے اربابِ اختیار سے ملنے کا موقع فراہم کرتے۔ بہت کم تخلیق کار ایسے ہیں جو دوسروں کو آگے بڑھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ ایوب صابر کا شمار ایسے ہی اہل قلم میں ہوتا ہے۔ اپنی بیماری کے دوران انھوں نے مجھے بہت سی تقریبات میں شریک ہونے کا اعزاز بخشا۔ ڈاکٹر ایوب صابر بغض، کینہ اور حسد سے بالاتر رہے۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ اور ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ سے انکی محبت ضرب المثل ہے۔

محمد ایوب صابر نے 2 جنوری 1940ء کو ایک دست کار، محنت پسند اور خردمند دوست محمد کے ہاں آنکھ کھولی۔ ایوب صابر کا لڑکپن تھا کہ ان کے بھائی احمد، قریش اور بہن شفا جوانی ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ 1970ء میں اُن کے والد اور 1971ء میں والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کی جدائی کا غم سینے میں لیے "صابر" ثابت قدم رہے۔

محمد ایوب صابر نے 1957ء میں ہائی سکول سرائے صالح سے میٹرک، گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد سے 1959ء میں ایف اے سیکنڈ ڈویژن اور بی اے کا امتحان 1969ء میں تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ 1963ء میں یونیورسٹی آف پشاور سے ایم اے اردو سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا جہاں انہیں ممتاز

دانشور، محقق، ماہرِ اقبالیات پروفیسر محمد طاہر فاروقی کی سرپرستی نصیب ہوئی۔ 1963ء میں گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے نطقِ گویائی سے سرفراز کر رکھا تھا۔ مٹھاس ان کے لب و لہجہ کی شناخت بن گئی اور وہ بہت قلیل عرصہ میں شاگردوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ہو گئے۔ علامہ محمد اقبال کے بارے میں ان کی تمام کتب اسی تحقیق اور تنقید کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ ان کی روزمرہ زندگی بھی انہی اصولوں کی آئینہ دار رہی۔ وہ سُنی سنائی بات کو آگے نہیں بڑھاتے بلکہ اس کے منظر اور پسِ منظر کو جانچنے اور سمجھنے کی بھرپور کوشش کرتے۔

ایم اے اردو کے دوران انھوں نے اقبال پر دو مقالے لکھے۔ "پیام اقبال کی اساس" اور "وحدت الوجود اور اقبال"۔ یہ ان کے زمانۂ طالب علمی میں اقبال شناسی کا سنگ میل ہیں۔ یہ مقالات ادبی مجلّہ "کاغان" اور رسالہ "خیابان" میں شائع ہوئے۔ ایم اے اردو کے دوران ہی ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے افکار نے محمد ایوب صابر کو اپنے حصار میں لے لیا۔ معترضینِ اقبال کے چہرے انھیں صاف نظر آنے لگے اور وہ فضائے بسیط میں اڑتے اڑتے معترضین اقبال کے ٹھکانوں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے پست ذہن لوگوں کو مدلل لفظوں سے نیست و نابود کرنے کا عزم کر لیا۔ اس ضمن میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کا مورچہ کارگر ثابت ہوا۔ 10 جولائی 1991ء کو یونیورسٹی کے شعبۂ اقبالیات سے ایم فل کر لیا۔ چیئرمین شعبہ اقبالیات ڈاکٹر محمد ریاض اور دوسرے اساتذہ محمد ایوب صابر کے مخفی جواہر سے متاثر ہوئے۔ "اقبال پر معاندانہ کتب کا جائزہ" تحقیقی مقالہ دیکھ کر اقبال کے معترضین کو دھچکا لگا۔ "اقبال دشمنی ایک مطالعہ" کے نام سے منظر عام پر آنے والے اس مقالہ نے مخالفین اقبال کو مایوس کیا اور عالمی سطح پر اس کتاب کو پذیرائی حاصل ہوئی۔ انھوں نے پی ایچ ڈی کا مقالہ بعنوان "اقبال کی شخصیت اور فکر و فن پر اعتراضات، تحقیقی و تنقیدی جائزہ" لکھ کر 2002ء میں پنجاب یونیورسٹی سے راقم الحروف اور ڈاکٹر محمد ایوب صابر نے پی ایچ ڈی کی ڈگری گورنر پنجاب جنرل خالد مقبول کے ہاتھ سے حاصل کیں۔

2023: پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب صابر صدرِ مملکت عزت مآب ڈاکٹر عارف علوی سے ملاقات کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر ایوب صابر نے متعدد اعزازات حاصل کیے جن میں "تمغۂ حسنِ کارکردگی 2006ء، علامہ اقبال ایوارڈ (تصور پاکستان، علامہ اقبال پر اعتراضات کا جائزہ) کے ضمن میں، ممبر بورڈ آف گورنرز (مقتدرہ قومی زبان)، ممبر بورڈ آف گورنرز (اقبال اکادمی پاکستان، شیخ احمد ذکی یمانی میڈلین اقبال اکیڈمی یو کے 2009ء، گولڈ میڈل اباسین آرٹس کونسل پشاور 1994ء، ممبر ایگزیکٹو کمیٹی نظریۂ پاکستان کونسل (ٹرسٹ) اسلام آباد 2010ء تا دمِ مرگ۔ 2021ء میں اُنھیں ستارۂ امتیاز سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر ایوب صابر نے بیرون ممالک سفر بھی کیے۔" سعودی عرب دو مرتبہ جانے کی سعادت ہوئی۔ پہلی بار 1992ء میں حج کے لیے اور دوسری بار 1996ء میں برطانیہ جاتے ہوئے عمرے کے لیے دیارِ حبیب ﷺ میں آنکھوں کی پیاس بجھانے کا موقع ملا۔ برطانیہ میں دو ماہ قیام کے دوران بی بی سی ریڈیو اردو سروس نے ان کے دو انٹرویو نشر کیے۔ اُن کا پہلا انٹرویو فکرِ اقبال جب کہ دوسرا اردو زبان کے آغاز سے متعلق تھا۔ پاکستان کمیونٹی، رڈنگ (برطانیہ) نے یوم اقبال کی تقریب میں لیکچر کے لئے انھیں مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا۔ 2008ء میں اقبال اکیڈمی یو کے اور اقبال اکیڈمی پاکستان کے زیر اہتمام دو روزہ بین الاقوامی سیمینار کیمبرج یونیورسٹی میں شرکت کی۔ " اقبال کی شعری و فکری جہات" کے موضوع پر ہندوستانی کونسل برائے ثقافتی رشتے اور کُل ہند یونیورسٹی اردو اساتذہ کے اشتراک سے 1997ء کو ٹیگور ہال دہلی یونیورسٹی میں انٹرنیشنل سیمینار میں پاکستان سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر تحسین فراقی، اور ڈاکٹر ایوب صابر کو مدعو کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر ایوب صابر نے "اقبال کی فکری اساس" کے موضوع پر

خصوصی مقالہ پیش کیا۔ انٹرنیشنل غالب انسٹیٹیوٹ دہلی کے زیر اہتمام بین الاقوامی غالب سیمینار 2007ء بعنوان "اقبال ایشیائی بیداری کا شاعر" میں ڈاکٹر ایوب صابر نے "اقبال اور مغربی فکر۔ بعض مغالطّوں کا جائزہ" کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔

ہائر ایجوکیشن کمیشن نے ستمبر 2006ء میں ڈاکٹر ایوب صابر کی خدمات Distinguished Educationist and Researcher کی حیثیت سے، دو سال کے لیے حاصل کیں۔ انہوں نے متعدد ورکشاپوں میں بیسیوں لیکچرز دیے۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے نصابات کو، متعلقہ کمیٹی کے متعدد اجلاس منعقد کر کے، بہتر بنایا۔ طلبہ کے لیے ایف ایم ریڈیو کے بیسیوں اور پی ٹی وی نیشنل کے لیے اکیس (21) لیکچرز ریکارڈ کروائے جو یکے بعد دیگرے تواتر کے ساتھ نشر اور ٹیلی کاسٹ ہوتے رہتے ہیں۔ اکادمی ادبیاتِ پاکستان کے اشتراک سے "عصرِ حاضر سے مکالمہ: فکرِ اقبال کی روشنی میں" اور اقبال اکیڈمی پاکستان کے تعاون سے "اقبال کے تصورِ اجتہاد" کے موضوع پر سہ روزہ قومی سیمینار میں مقالے پیش کیے۔ "آزاد کشمیر میں نفاذِ اردو" مقتدرہ قومی زبان 1984، "پاکستان میں اردو کے ترقیاتی ادارے" مقتدرہ قومی زبان 1985، "ادبستان ہزارہ" بزم اہلِ قلم ہزارہ 1989، اقبال دشمنی ایک مطالعہ، جنگ پبلشرز لاہور 1993، "اردو کی ابتداء کے بارے میں محققین کے نظریات" سرحد اردو اکیڈمی 1993، "انتخاب خطوط غالب" فیس بکس لاہور 1993، "پاکستانی شاعری/ ایبٹ آباد کے غزل گو شعرا" انٹرنیشنل اردو پبلی کیشنز دہلی 2000" اقبال کی شخصیت پر اعتراضات کا جائزہ" بیت الحکمت، لاہور 2003، "اقبال کا اردو کلام: زبان و بیان کے چند مباحث، مقتدرہ قومی زبان 2003، کلام اقبال پر فنی اعتراضات: ایک جائزہ (اشاعت دوم)، پورب اکادمی اسلام آباد 2010، "معترضین اقبال" انٹرنیشنل اردو پبلی کیشنز دہلی 2004، " تصور پاکستان، علامہ اقبال پر اعتراضات کا جائزہ"، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد 2004، " اقبال کی فکری تشکیل: اعتراضات اور تاویلات کا جائزہ"، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد 2007، علامہ اقبال کا تصور اجتہاد اقبال اکیڈمی پاکستان، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی (شریک ناشر) 2009، " نظریۂ پاکستان" نظریہ پاکستان کونسل (ٹرسٹ) اسلام آباد 2012، "پاکستان میں غیر مسلموں کے حقوق" نظریہ پاکستان کونسل (ٹرسٹ) اسلام آباد 2019 کے تحت اشاعت پذیر ہوئیں۔

ڈاکٹر ایوب صابر کا یہ تحقیقی منصوبہ "اقبال کی شخصیت اور فکر و فن پر اعتراضات" تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ ہر جلد میں دو، دو کتب شامل ہیں جن کی مختصر تقسیم یوں ہے۔ پہلے 18 صفحات پر ڈاکٹر ایوب صابر کا تحریر کردہ پیش لفظ ہے جو اُنھوں نے 9 نومبر 2017ء (یومِ اقبال) کے موقع پر تحریر کیا۔ جلد اوّل (کتاب اوّل: معترضین۔ کتاب دوم: فکری تشکیل)۔ جلد دوم (کتاب سوم:

2015: بانی چیئرمین نظریہ پاکستان کونسل جناب زاہد ملک ہفتہ اقبال تقریب میں خطاب کر رہے ہیں، سٹیج پر پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب صابر مہمانوں کے ساتھ تشریف فرما ہیں۔

شخصیت، کتاب چہارم: تصورِ پاکستان)، جلد سوم (کتاب پنجم: فہمِ اسلام، کتاب ششم: فنِ شاعری)۔ مجموعی طور پر تحقیق و تنقید کا یہ شہکار 2034 صفحات پر مشتمل ہے۔ جلد اوّل صفحہ 19 تا 642 تک، جب کہ جلد دوم 643 تا 1254 صفحات پر محیط ہے۔ جلد سوم 1255 تا 1946 صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہ ایک کتاب "عظیم تر پاکستان" لکھنے کے خواہش مند تھے لیکن زندگی نے وفا نہ کی۔ ڈاکٹر ایوب صابر کی زندگی ہم سب کے لیے قابلِ تقلید ہے۔ اُنھوں نے جس نظم و ضبط کے ساتھ زندگی گزاری وہ مثالی ہے۔ وقت اور وعدے کی پابندی کے خوگر ڈاکٹر ایوب صابر نے اُصولوں پر کبھی سودے بازی نہ کی۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ اور ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ سے محبت اُن کے خمیر کا حصہ رہی۔ یہی اُمید ہے کہ بریگیڈیئر فہد ایوب، کرنل فائق اور فائزہ ایوب اپنے والدِ گرامی کی جلائی ہوئی شمع روشن رکھنے کے لیے اپنا کردار ادا کریں گے۔ انشاء اللہ

خمستانِ ازل کا ساقی

ظفر ملت۔ ظفر علی خان

سید ظہیر احمد گیلانی

23 مارچ 1940ء کا تاریخی دن تھا۔ لاہور میں حضرت قائداعظمؒ کی صدارت میں مسلم لیگ کا جلسہ برپا تھا۔ نواب صاحب ممدوٹ کا انتظام واہتمام تھا۔ مسلم لیگ کے بڑے بڑے زعما سٹیج پر رونق افروز تھے۔ قائداعظم نے تاریخی خطبہ صدارت پیش فرمایا۔ خطبہ انگریزی زبان میں تھا۔ خطبہ ختم ہوتے ہی قائداعظم کے حکم سے ایک صاحب اُٹھے اور قائداعظم کی پوری تقریر کا انگریزی سے اردو ترجمہ اپنے حافظے اور دونوں زبانوں پر مکمل عبور کی بنا پر روانی سے بیان کر دیا۔ ان صاحب نے قرار دادِ پاکستان کی تائید کا فریضہ بھی انجام دیا۔ یہ صاحب تھے مولانا ظفر علی خان جن کے بارے میں قائداعظم نے فرمایا تھا "مجھے پنجاب میں ظفر علی خان کی رفاقت حاصل ہو تو میرے سفر کی ہر مشکل رفع ہو جاتی ہے۔ وہ پنجاب کے مسلمانوں کی ایک متحرک تصویر ہیں"۔

21 مارچ 1937ء کو شاہی مسجد لاہور میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا "مجھے اپنے صوبے سے ظفر علی خان جیسے دو چار بہادر آدمی دے دیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پھر کوئی مسلمانوں کو شکست نہیں دے سکتا"۔

کم وبیش یہی بات مولانا کے بارے میں حضرت قائداعظم نے 1945 میں بھی پشاور میں فرمائی۔

حضرت علامہ اقبالؒ نے فرمایا "ظفر علی خان غیر معمولی دل ودماغ کے آدمی ہیں۔ ان کا قلم اپنی روانی میں دنیا کے بڑے بڑے مجاہدین کی تلوار سے کم نہیں"۔

محسنِ اسلامیان ہند نواب محسن الملکؒ نے دَکن کے نواب افسر الملک کو تحریر کیا کہ "ظفر علی خان ایک ایسا نوجوان ہے جس سے اس خیال میں پختگی ہوتی کہ نئی پود میں علم وقلم کے جوہر کی کمی نہیں ہے"

حضرت علامہ شبلی نے کہا کہ "ظفر علی خان کا نام وکام محو ہونے کی چیز نہیں"۔

آپ کا یہ فرمان تو سرسید کے ہر شاگرد کو یاد ہے کہ "علی گڑھ کو محمد علی کی قابلیت اور ظفر علی خان کی جرات پر ہمیشہ فخر رہے گا"۔

مولانا محمد علی جوہر نے کہا تھا "ظفر علی خان کے کلام میں جو تلخی ہے وہ سیاست کی ہے اور جو چاشنی ہے وہ ادب کی ہے"۔

حضرت مولانا سید سلمان ندوی نے انہیں اردو کے تین کامل الفن شاعروں (مرزا محمد رفیع سودا، اکبرالہ آبادی اور ظفر علی خان) میں سے ایک قرار دیا۔

ظفر علی خان نے سرسید کی زیرِ نگرانی اور شبلی نعمانی کی زیرِ تربیت تعلیم حاصل کی تھی۔ سرسید نے نواب محسن الملک کو ایک خط میں لکھا تھا:

"میں اس نوجوان میں ایک روشن مستقبل کے آثار دیکھ رہا ہوں"

ظفر علی خان نے علی گڑھ کالج میں سرسید کی شان میں ایک طویل نظم فارسی زبان میں سنائی تو سرسید نے انہیں گلے لگا لیا اور فرمایا کہ تم ایک دن "ظفرِ ملت" بنو گے۔

مولانا ظفر علی خان علی گڑھ کالج کے ان تین ہونہار شاگردوں میں سے ایک تھے جنھوں نے عمر بھر انگریزی استعمار کے خلاف جدوجہد کی۔ دوسرے دو

حضرات تھے حسرت موہانی اور محمد علی جوہر۔ اس تکون کے کارناموں پر غور کریں تو انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ میرا ارادہ تو ان تینوں پر اکٹھے لکھنے کا تھا مگر جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ یہ ایک بھاری پتھر ہے کب مجھ ناتواں سے اٹھتا ہے۔ بہر حال ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا حسرت موہانی رئیس المعتزلین بھی تھے اور جیلوں میں چکی کی مشقت کا بھی لطف لیتے رہے جبکہ مولانا محمد علی جوہر رئیس الاحرار تھے اور انہوں نے غلام مُلک میں دفن ہونے سے بھی انکار کر دیا اور فلسطین کی خاک میں جا آسودہ ہوئے۔ پھر ان دونوں کے درمیان ظفر علی خان کیا تھے، وہ ایک آندھی تھے۔ ایسی آندھی جو استعمار کی شمع بجھانے کے لئے چلی اور بار بار چلی، ایسا طوفان جس سے دریاؤں کے دل دھل جائیں۔ یہ طوفان پنجاب سے اُٹھا اور ہندوستان بھر میں طاغوتی قوتوں کو مسمار کرتا چلا گیا۔ وہ ایسا شدید زلزلہ تھے جس سے نہ صرف ہندوستان بلکہ انگلستان کے ایوان بھی لرز اُٹھے۔ وہ ایک سمندر تھا جس کی بپھری ہوئی لہریں دشمنانِ اسلام کی تلاش میں ہر استعماری ساحل سے جاٹکرائیں۔ وہ اقبال کے مردِ مومن تھے جس کی شخصیت میں زورِ حیدرؓ، فقرِ ابوذرؓ، اور صدقِ سلمانیؓ کی جھلکی نظر آتی تھی۔ وہ ایک شیر تھے جس کی دھاڑ سے استبدادی قوتیں دبک کر دم سادھ لیتیں اور روباہی چالیں چل کر اس شیر کو دامِ فریب میں پھانسنے کی ناکام کوششیں شروع کر دیتیں۔ مولانا ظفر علی خان ان پراسرار بندوں میں سے تھے جنھیں ذوقِ خدائی عطا ہوا تھا۔ جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا :

دو نیم کی ٹھوکر سے صحرا اور دریا   سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

مولانا ظفر علی خان کی جرات، ہمت، سیاست، خطابت، حریت فکر و امانت کو پلتے بڑھتے دیکھنا ہو تو آیئے آپ کو گلمرگ کشمیر لیے چلتے ہیں جہاں ڈاکخانے کے باہر ایک بچہ بیٹھا اپنے والد کا انتظار کر رہا تھا کہ اس کے والد محترم اس ڈاکخانے میں ملازم تھے۔ اتنے میں ایک "انگریز کپتان بڑے کر وفر اور تمکنت کے ساتھ گھوڑے پر سوار آیا۔ باہر ہندوستانی غلاموں کے لڑکے کو بیٹھا دیکھ کر اس حاکمانہ شان سے کہا" چھوکرا اس کا لگام پکڑو ہم ابھی آتا"۔۔۔۔۔ اس پر لڑکے نے حکم بجالانے کی بجائے تنک کر جواب دیا" میں تمہارا غلام یا نوکر نہیں جو لگام پکڑے کھڑا رہوں"۔

یہ گستاخ لڑکا خدادادخان تھا جو بعد میں مولانا ظفر علی خان بنا۔ 1872ء میں سیالکوٹ کے ایک چھوٹے سے گاؤں امرناتھ میں پیدا ہونے والا بچہ اپنے والد محترم مولانا سراج الدین صاحب کی آشیرباد پر مدینۃ العلم علی گڑھ کالج پہنچا تو سٹوڈنٹس یونین کا جنرل سیکرٹری بنا اور بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ علی گڑھ میں اس وقت عام رجحان یہ تھا کہ اس سے ذہین اور قابل طلبہ سندِ فراغت حاصل کرنے کے بعد ملازمت کے سنہری بت کے پرستار بن جائیں اور اس طرح اپنی قابلیتوں اور قوتوں کو ہندوستان کی زنجیرِ غلامی کو مستحکم کرنے میں صرف کر دیں چنانچہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں عام طور پر حکومت کی اطاعت، وفاداری کے مواعظِ حسنہ کے بعد عجز ونیاز سے یہ عرض کیا جاتا تھا کہ فلاح جگہ خالی ہوئی ہے۔

کانگریس کے اجلاس کراچی میں سردار پٹیل نے آپ کو نماز ادا کرنے پر ٹوکا، آپ نے نماز کیا چھوڑنی تھی کانگریس کو ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ جارج پنجم نے دہلی میں دربار کیا۔ نماز کا وقت ہوا تو مولانا ظفر علی خان نے عین دربار میں کھڑے ہو کر آذان دی اور یوں حسین ابن علیؓ کے اس پیروکار نے رفقائے حسینؓ کی یاد تازہ کر دی

ازراہِ کرم اب کی بار اس زنجیرِ ملازمت میں کسی مسلمان کو پابند کیا جائے اور بارگاہ عالی سے جواب ملتا کہ مابدولت اس سے غافل نہیں ہیں۔

اکبرالہ آبادی نے اس صورت حال کو یوں بیان کیا ہے:

ہم کیا کہیں احباب کیا کارنمایاں کر گئے
بی اے ہوئے ، نوکر ہوئے، پنشن ملی پھر مر گئے

مگر علی گڑھ میں ہی کچھ ایسے نوجوان پیدا ہوئے جنھوں نے اس ذہنی غلامی اور اطاعت وتسلیم کی اس راہ قدیم پر چلنے سے انکار کر دیا اور اپنی عمریں استعمار کے خلاف لڑنے، ظلم واستبداد برداشت کیے بغیر گزار دیں۔ مولانا ظفر علی خان ان ہی جیالوں میں سے ایک تھے۔ انہوں نے اپنی عمر عزیز کے 14 قیمتی سال پسِ زنداں گزارے مگر ان کے پائے استقلال میں ایک لمحہ کے لئے بھی لغزش پیدا نہیں ہوئی بلکہ روز بہ روز اضافہ ہی ہوتا رہا۔ مولانا ظفر علی خان جہاں سرسید کی تعلیمی تحریک سے وابستہ تھے وہاں وہ سید جمال الدین افغانیؒ کے پین اسلام ازم سے بھی متاثر تھے۔ ان کے سامنے مسلمانوں کا ہزار سالہ دورِ حکومت

تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنی عظمتِ رفتہ اور سطوتِ گم گشتہ کو پھر سے حاصل کر سکیں۔ انہوں نے انگریز کی ملازمت سے بچتے ہوئے حیدر آباد دکن "سلطنت آصفیہ" کی خدمت کو ترجیح دی اور بڑا مقام پایا لیکن شاطر انگریز نے خطرے کو بھانپتے ہوئے مولانا کو دکن بدر کروا دیا۔

مولانا پنجاب واپس آئے تو سر مائیکل ایڈوائر پنجاب کے گورنر بن گئے اور وہی ایڈوائر صاحب ہیں جن کی قیادت میں جنرل ڈائر نے جلیانوالہ باغ امرتسر میں عوام کے خون سے ہولی کھیلی۔

مولانا ظفر علی خان نے پنجاب آ کر زمیندار اخبار کی ذمہ داری سنبھالی یہ اخبار ان کے والد محترم اپنے گاؤں کرم آباد سے ہفتہ وار نکالا کرتے تھے۔ ظفر علی خان نے اخبار کو نئے انداز سے لاہور سے نکالنا شروع کیا۔ انہوں نے نہ صرف صحافت کے جدید ترین اصولوں کو اختیار کیا بلکہ جدتیں بھی پیدا کیں اور بابائے صحافت کہلائے۔ سر مائیکل ایڈوائر گورنر پنجاب نے اس اخبار کے بارے میں تاثرات بیان کرتے ہوئے رپورٹ میں لکھا کہ "زمیندار ایک آتش بار اخبار ہے۔ اس کا ایڈیٹر ایک آتش مزاج ظفر علی خان ہے جس نے 1912ء میں ترکوں کے لئے چندہ فراہم کرنا شروع کیا اور یہ رقم پیش کرنے کے لئے خود قسطنطنیہ گیا۔ وہاں سے واپسی پر اس کا انداز بیان پہلے سے زیادہ باغیانہ، شوخ بلکہ آتشیں ہو گیا"۔

مائیکل ایڈوائر نے کہا کہ "میں ظفر علی خان کو سزا دیتے دیتے تھک گیا ہوں لیکن وہ نہیں تھکا"۔ انہی ایڈوائر صاحب نے اپنے ایک مضمون India as I know it میں تسلیم کیا کہ "ظفر علی خان نے برطانوی اقتدار کو مسلسل دعوت مبارزت دی۔ وہ مدت العمر اس سے مصروف پیکار رہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے"۔

زمیندار عوامی اخبار تھا۔ عوام کی آواز تھی۔ آزادی ہند کی تحریک زمیندار اخبار کے بغیر کبھی مکمل نہیں کہلا سکتی۔ زمیندار نے عام لوگوں میں ذوق اخبار بینی پیدا کیا۔ اخبار کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ سرحد کے جیالے ایک آنے کا اخبار زمیندار خریدتے اور ایک آنہ دے کر اسے پڑھوا کر سنتے۔ زمیندار نے صحافت اور قربانی دونوں چیزیں ملک کو سکھائیں۔

مولانا ظفر علی خان انگریزی استبداد اور اس کے استعماری ستونوں سے ہمیشہ پنجہ آزما رہے۔ مولانا نے اپنی آتش بیان خطابت، شمشیر بکف صحافت اور شاعرانہ لطافت سے انگریزی استعمار کی ہیبت کو لوگوں کے دلوں سے نکالنے میں اہم کردار ادا کیا اور اس کے نتیجہ میں ہندو فرہنگ کی سازشوں اور ظلم و ستم کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ آپ کا اخبار بند کیا گیا۔ ضمانت ضبط کی گئی، پریس ضبط کیا گیا۔ قید و بند کی صعوبتوں سے گزارا گیا مگر انہوں نے آبلہ پائی کے باوجود حریت و آزادی کی دشت پیمائی سے دست برداری کا سوچا نہ مایوس و نامرادی کو قریب پھٹکنے دیا۔

مولانا فرماتے ہیں:

دل ضبط، جگر ضبط، زبان ضبط، افغاں ضبط
سب سازِ عیاں ضبط، ہے سوزِ نہاں ضبط

اس کے باوجود کہتے ہیں:

روکیں گے کیونکر میرے خامہ کی روانی
تنکے سے بھی ہوتا ہے کہیں سیل رواں ضبط

استعماری آلہ کاروں، حاسدوں، بڑے نوابوں، زمینداروں، سرداروں، اور خان بہادروں نے واویلا مچایا کہ "زمیندار مسلمانوں میں بغاوت کے بیج بو رہا ہے"۔ اس پر مولانا نے فرمایا:

جب سے ہم میں آنریبل اور مسٹر پیدا ہوئے
سوئے فتنے جاگ اُٹھے اور شر پیدا ہوئے
حاسدان تیرہ باطن کے جلانے کے لئے
تجھ میں اے پنجاب اقبال و ظفر پیدا ہوئے

اپنے وقت کے دیگر بڑے لیڈران کی طرح مولانا ظفر علی خان بھی ہند اور دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے عوام سے مل کر انگریز استعمار کے خلاف ایک مضبوط متحدہ قوت بنانا چاہتے تھے لیکن ایک طرف کانگریس کی منافقانہ چالوں نے اور دوسری طرف شدھی سنگھٹن کی اسلام دشمن تحاریک نے ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔ ہندو مہا سبھا نے مسلمانوں کو برصغیر سے نکالنے کے لئے راشٹریہ سیوک سنگھ بنا کر مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑنے شروع کر دیئے۔ مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ ان کے مکانات جلائے گئے۔ مسلمانوں کو ہندو مت اختیار کرنے یا عرب ممالک کو ہجرت کر جانے پر مجبور کیا جانے لگا تو اس کے پس پشت خفیہ ہاتھ کو طشت از بام کرتے ہوئے فرمایا:

بھارت میں بلائیں دو ہی تو ہیں، ایک ساورکر، ایک گاندھی ہے
ایک جھوٹ کا چلتا جھکڑ ہے اک مکر کی اُٹھتی آندھی ہے

شدھی سنگھٹن کے مقاصد سے مسلمانوں کو آگاہ کرتے ہوئے فرمایا:

سنگھٹیوں کے دلوں میں یہی اک خواہش ہے

مسلمانوں کے اس دیس میں ہستی نہ رہے
رب اکبر کا جہاں نام لیا جاتا ہے
کشور ہند میں ایسی کوئی بستی نہ رہے

آج بھی بھارت میں اسی خواہش کو پورا کرنے کی عملی جدوجہد جاری ہے۔ مگر افسوس کہ قافلہ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں۔

پورے برصغیر میں جہاں کہیں شدھی سنگھٹن کی کوشش ہوئی مولانا وہیں برق کی طرح کوندے اور رعد کی طرح گرجے، جہاں سے خبر آئی کہ مسلمانوں کو آذان سے روکا جا رہا ہے مولانا فوراً وہاں پہنچے اور سر عام آذان دی۔ کانگریس کے اجلاس کراچی میں سردار پٹیل نے آپ کو نماز ادا کرنے پر ٹوکا، آپ نے نماز کیا چھوڑنی تھی کانگریس کو ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ ایک مرتبہ جارج پنجم نے دہلی میں دربار کیا۔ نماز کا وقت ہوا تو مولانا ظفر علی خان نے عین دربار میں کھڑے ہو کر آذان دی اور یوں حسین ابن علیؓ کے اس پیروکار نے رفقائے حسینؓ کی یاد تازہ کر دی۔

مولانا ظفر علی خان وہ واحد شخصیت ہیں جنہوں نے 1906ء میں قیامِ مسلم لیگ کے تاریخ ساز معرکے سے لیکر قیامِ پاکستان کے عظیم معجزے تک ہر جدوجہد میں دامے، درمے، سخنے بھرپور حصہ لیا۔ جب قائداعظم نے علامہ اقبال اور دیگر اکابرین کی تحریک پر مسلم لیگ کا احیا کیا تو مولانا ظفر علی خان نے اپنی تنظیم "اتحاد ملت کو مسلم لیگ میں ضم کر دیا اور آخری دم تک قائداعظم کا ہی دم بھرتے رہے۔ انہوں نے مسلم لیگ کی تنظیم نو کے سلسلے میں ہندوستان بھر میں طوفانی دورے کئے اور مسلم لیگ مخالف ہر قوت کے خلاف تقریری اور تحریری جہاد کیا۔ آپ دو بار مرکزی اسمبلی کے لئے منتخب ہوئے۔ 1938ء کے ضمنی انتخاب میں مسلم لیگ نے کانگریس کو ذلت آمیز شکست سے دوچار کیا تو مسلم لیگ نے دہلی میں عظیم الشان جلوس نکالا۔ مولانا ظفر علی خان حضرت قائداعظم کے پہلو بہ پہلو جلوس میں موجود تھے۔ آپ اپنی مادرِ علمی علی گڑھ یونیورسٹی تشریف لے گئے تو قائداعظم کے جیالوں نے آپ کا جلوس اس شان سے نکالا کہ علی گڑھ کی گاڑی کے گھوڑوں کو کھول دیا اور اسے خود کھینچ کر یونیورسٹی تک لے گئے۔

مولانا ظفر علی خان ایک عظیم المرتبت رہنما ہونے کے علاوہ جلیل القدر ادیب، بلند پایہ شاعر اور صاحبِ طرز انشاء پرداز تھے۔ بدیہہ گوئی میں کوئی ان کا حریف نہیں تھا۔ انشا اور اکبر کے بعد انہوں نے سنگلاخ زمینوں اور مشکل قوافی میں ایک دلآویز ذخیرہ چھوڑا ہے۔ ان کے اشعار میں ادق اور ثقیل قوافی بڑے سبک اور مانوس لگتے ہیں۔ ظفر علی خان کی ندرت مضامین اور قوافی پر ختم نہیں ہو جاتی وہ نئے استعارے ایجاد کرتے اور طنز کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ مولانا کے طنزیہ کلام سے فرنگ و ہنود کا طنطنہ ہمیشہ لرزاں و ترساں رہا۔ آپ نے اس وقت کی سیاسی الجھنوں، ماحول اور مسلمانوں کو درپیش مشکلات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ظفر علی خان کی شاعری کا دوسرا رُخ بھی ہے، پہاڑوں میں بہنے والی سرکش ندی جب میدان میں داخل ہوتی ہے تو ایک پاٹ دار اور نرم رو دریا بن جاتی ہے۔ اس دریا سے کھیت سیراب اور کشتِ دل ہری ہوتی ہے۔ ظفر علی خان کی شاعری کا یہ رُخ نعت کے میدان میں نظر آتا ہے۔ ادھر دشمن ان سے پناہ مانگتا ہے۔ ادھر یہ دامان دوست میں پناہ لیتے ہیں۔ ایک طرف آورد کا زور و شور ہے اور دوسری جانب پس آمد ہی آمد۔ نعت گوئی میں ظفر علی خان اس درجہ کمال تک پہنچے جو ان سے بہتر شاعروں کو نصیب نہ ہوا۔ دراصل نعت کے لئے کمال سخن وری سے زیادہ کمال جنون کی ضرورت ہوتی ہے اور ظفر علی خان کے پاس وارفتگی کا بڑا وافر سرمایہ تھا۔

مولانا ظفر علی خان کو جناب رسالت مآب، ختمی مرتبت، فخر کون و مکان، داور محشر، رحمت للعالمین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ سلم سے دیوانگی کی حد تک عشق تھا۔ فرماتے ہیں:

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمہی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمہی تو ہو
سب کچھ تمہارے واسطے پیدا کیا گیا
سب غایتوں کی غایت اولیٰ تمہی تو ہو
وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز جھلکنے والی تھی کل دنیا کے درباروں میں
اے کہ تیرا جمال ہے زینت محفلِ حیات
دونوں جہانوں کی رونقیں ہیں تیرے حسن کی زکوۃ
بارگاہِ الست سے بخش دیئے گئے تجھے
سب ملکی تصرفات سب فلکی تجلیات

مولانا ظفر علی خان کے عشقِ رسول ﷺ کا ذکر اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک جھوٹے نبی اور اس کے ساتھیوں کے خلاف مولانا کے جہاد کا ذکر نہ کیا جائے۔ آپ نے پوری ایک کتاب ارمغانِ قادیان کے نام سے لکھی اور فرمایا:

امت مرزا جھاڑ کی صورت لپٹی ہے دین کے دامن سے
برق کلیسا کھیل رہی ہے یثربیوں کے خرمن سے

بقیہ صفحہ 19 پر

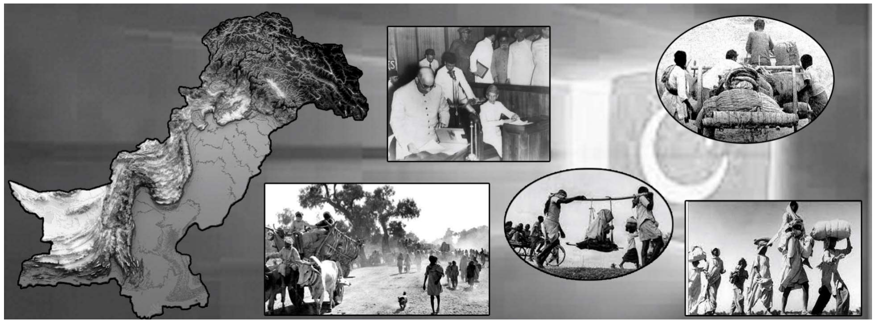

قیامِ پاکستان میں درپیش مسائل اور قائداعظم کے اقدامات

پروفیسر عفت گُل اعزاز

قیامِ پاکستان کے ساتھ نئی مملکت کو بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بھارت ہر طرح سے پاکستان کے لئے مشکلات پیدا کر رہا تھا تاکہ پاکستان کی مملکت سنبھل نہ سکے اور ناکام ہو جائے۔ قائداعظم نے انگریزوں اور ہندوؤں کی لاکھ رکاوٹوں کے باوجود پاکستان حاصل کرلیا۔ اب اس ملک کو قائم و دائم رکھنا تھا، اسے دشمنوں کی سازشوں سے بچا کر ترقی کی شاہراہ پر گامزن کرنا تھا۔ قائداعظم نے ہر مشکل خنداں پیشانی سے برداشت کی۔ وہ پاکستانی عوام کو محنت، خلوص اور دیانت داری سے ذمہ داریاں ادا کرنے کی تاکید کرتے رہے۔ انہوں نے اپنے وطن کے لئے اپنے آرام اور صحت تک کی پرواہ نہ کی۔ دن رات کام میں لگے رہے، بے شمار مسائل تھے، مشکل حالات تھے مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری اور پاکستان کی نئی نوزائیدہ مملکت کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے اُنہوں نے جو اقدامات کئے وہ درج ذیل ہیں۔

وسائل کی کمی: حکومت چلانے کے لئے دفاتر کی عمارات اور ضروری سازوسامان نہیں تھا۔ فوجی بیرکوں میں دفاتر قائم کئے گئے اور کام کا آغاز کر دیا گیا۔ رفتہ رفتہ حالات بہتر ہوتے چلے گئے اور کراچی کو دارالخلافہ (Capital) بنایا گیا۔

دستوری مسائل: نئی مملکت اسلام کے نام پر قائم ہوئی تھی، یہاں اسلامی دستور کے مطابق اصول وقوانین بنائے جانے تھے، فوری طور پر دستور بنانا ممکن نہ تھا اس لئے 1935ء کے ایکٹ میں ضروری ترامیم کر کے عبوری دستور بنالیا گیا۔ قائداعظم کا موقف واضح تھا "پاکستان کا دستور ابھی بننا ہے، میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر مبنی ہوگا اور جمہوری نوعیت کا ہوگا"۔

اثاثوں کی تقسیم: دونوں مملکتوں یعنی ہندوستان اور پاکستان کو نقد اثاثے دیئے جانے تھے۔ دونوں ملکوں کے نمائندوں کے درمیان مذاکرات میں یہ طے کیا گیا کہ پاکستان کو پچھتر کروڑ روپے ادا کئے جائیں گے اور سترہ فیصد قرضے پاکستان ادا کرے گا۔ (بھارت نے سرف بیس کروڑ روپے ادا کئے اور باقی رقم روک لی۔ یہ امر قائداعظم کے لئے باعثِ تشویش تھا۔ قائداعظم پاکستان کے حقوق کے لئے ڈٹے رہے۔ اُن کی لگاتار کوششوں کی وجہ سے ہندوستان کو بعد میں یہ رقم ادا کرنی پڑی۔

فوج اور فوجی سازوسامان: لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تقسیمِ ہند کے اس اہم مرحلے پر ہندوؤں کی طرفداری کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اُس نے پاکستان کی فوج رکھے جانے کے بارے میں اعتراض کیا اور "مشترکہ دفاع" کا نظریہ پیش کیا۔ قائداعظم نے اس تجویز کو رد کر دیا پھر ماؤنٹ بیٹن کو فوج کی تقسیم کے لئے کیشن مقرر کرنا پڑا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ پاکستان کو ایک تہائی فوج اور فوجی سازوسامان دیا جائے گا۔ تمام اسلحہ ساز فیکٹریاں اور اسلحے کے ڈپو بھارتی علاقوں میں تھے، بھارت اپنی روایتی تنگ دل اور بغض وعناس کی وجہ سے

پاکستان کو یہ چیزیں نہیں دینا چاہتا تھا۔ اُن کے کمانڈر انچیف نے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا۔ تب بھارت نے مجبوراً ناقابلِ استعمال سامان اور تھوڑی مقدار میں اسلحہ پاکستان کے حوالے کر دیا۔ فوج کی منتقلی 1948ء تک ممکن ہوسکی۔ قیامِ پاکستان سے پہلے کانگریس حکومت نے بہت سے مسلمان فوجیوں کو ملک سے باہر برما کے محاذ پر منتقل کر دیا اور ملک میں موجود مسلمان فوجیوں سے اسلحہ واپس لے کر انہیں نہتا کر دیا تاکہ پاکستان کے فوج رہے اور نہ اسلحہ ہے اور یہ اپنے دفاع میں ناکام رہیں۔ اُن کی بدنیتی باعثِ افسوس تھی۔ قائداعظم اور پاکستانی عوام کی متحدہ کوششوں سے اُن کے ناپاک عزائم کبھی پورے نہ ہوئے۔

نہری پانی کا مسئلہ: دریائے راوی پر مادھوپور کا ہیڈ ورکس اور دریائے ستلج پر فیروز والا ہیڈ ورکس بھارت کو مل گئے۔ یہاں سے نکلنے والی نہریں پاکستان کے پنجاب والے علاقے کو سیراب کرتی تھیں۔ اپریل 1948ء میں بھارت نے اچانک نہروں کا پانی بند کر دیا جس سے فصلوں کو سخت نقصان پہنچنے لگا۔ پانی زندگی کی اہم ضرورت ہے۔ پانی کی کمی سے سرسبز کھیت ویران ہونے لگے اور بہت سے مویشی مرنے لگے۔ قائداعظم نے بھارت سے ان نہروں میں پانی جاری کرایا۔

مرکزی کابینہ کی تنظیم: قائداعظم نے گورنر جنرل کے عہدے کا حلف اُٹھایا۔ انہوں نے نواب زادہ لیاقت علی خان کو وزیرِ اعظم کیا۔ ان کے ذمے امورِ خارجہ، دفاع اور دولتِ مشترکہ (Common wealth) تھے۔ ملک غلام محمد کو وزارتِ خزانہ دی گئی۔ سردار عبدالرب نشتر کو وزارتِ مواصلات اور راجہ غضنفر علی خان کو محنت، خوراک اور زراعت کے محکمے دیئے گئے۔ فضل الرحمٰن کو وزارتِ داخلہ اور وزارتِ تعلیم دی گئی۔ چوھدری ظفراللہ خان کو وزیرِ خارجہ مقرر کیا گیا۔ اسطرح انہوں نے پاکستان کی پہلی کابینہ تشکیل دی۔

اقوامِ متحدہ کی رُکنیت: قائداعظم کی کوششوں کی وجہ سے پاکستان ستمبر 1947ء میں اقوامِ متحدہ (United Nations) کا رُکن بن گیا۔

سفارتی تعلقات کا آغاز: پاکستان نے دنیا کے ممالک کے ساتھ خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کے لئے ضروری اقدامات کئے۔ امریکہ اور روس، دولت مشترکہ کے ممالک، چین اور اسلامی ممالک سے تعلقات قائم کئے گئے۔ قائداعظم نے راجہ غضنفر علی خان کو ایران کا سفیر بنا کر بھیجا اور ملک فیروز خان نون کو سفیر بنا کر اسلامی ممالک کے دورے پر بھیجا۔

دفاعِ پاکستان: قبائلی علاقوں میں فوج تعینات تھی۔ قائداعظم نے فوج کو پاکستان کی سرحدوں پر منتقل کیا۔ چوھدری محمد علی نے دفاعی فوجی ہیڈ کوارٹر قائم کیا اور دفاعِ پاکستان کے لئے موثر اقدامات کئے۔

اسٹیٹ بینک کا قیام: قیامِ پاکستان کے وقت پاکستان میں بینکاری اور کرنسی کا کوئی نظام نہیں تھا۔ قائداعظم نے 1948ء کے آغاز میں زاہد حسین کو کرنسی اور اسٹیٹ بینک کی قائم کرنے ہدایت دیں۔ جولائی 1948ء میں اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے افتتاح کی تقریب میں شرکت کرنے کے لئے قائداعظم جو اُس وقت بہت بیمار اور کمزور ہو چکے تھے اور آرام کی غرض سے زیارت ایک صحت افزا مقام پر تھے، خاص طور پر وہاں سے کراچی پہنچے۔ یہاں اُنہوں نے اسٹیٹ بینک کا افتتاح کیا۔ اس بینک کے قائم ہونے سے معاشی نظام پر بیرونی تسلط ختم ہوگیا۔

قائداعظم نے سرکاری افسروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ قوم کے خادم کی حیثیت سے اپنے فرائض ادا کریں۔ یہ آپ کا اپنا ملک ہے۔ آپ انصاف، ایمانداری اور ثابت قدمی سے اپنے فرائض ادا کریں۔ پہلے وہ غیر ملکی حکومت کے ملازم تھے اب آپ ایک آزاد ملک کے ملازم ہیں۔

قائداعظم نے قوم کو نسلی اور صوبائی تعصب کی تباہ کاریوں سے بچنے کی ہدایت کی۔ انہوں نے فرمایا "پاکستان کے قیام کو روکنے کی کوشش ناکام ہونے کے بعد دشمن اپنی شکست سے پریشان ہو کر مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا چاہتا ہے۔ وہ صوبہ پرستی کو ہوا دے رہا ہے۔ اس لئے آپ بنگالی، سندھی، بلوچی اور پٹھان کے بجائے ایک قوم بن کر سوچیں"۔

قائداعظم نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے انہیں قوم کا قیمتی سرمایہ اور پاکستان کی امیدوں کا مرکز قرار دیا۔ انہوں نے فرمایا "پاکسان کو اپنے نوجوانوں پر فخر ہے۔ آپ ہی پاکستان کے معمار ہیں۔ اس لئے ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے مناسب تعلیم اور تربیت حاصل کریں" انہوں نے محنت اور جفا

کشی کا سبق دیا۔

مسئلہ کشمیر: قائداعظم نے کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ قرار دیا۔ انگریزوں کی ہندونوازی اور ہندوؤں کی غاصبانہ چالوں کی وجہ سے کشمیر کو پاکستان میں شامل نہ ہونے دیا گیا۔ کشمیر اسّی فیصد آبادی مسلمان تھی۔ انگریزوں نے ریاست کشمیر کو ڈوگر راجہ کے ہاتھ بیچ دی۔ انہوں نے اپنے ہم طنوں پر بہت ظلم ڈھائے۔ 19/ جولائی 1947ء کو کشمیریوں کی نمائندہ جماعت مسلم کانفرنس نے اپنے سری نگری کے اجلاس میں پاکستان کے ساتھ الحاق کی قرارداد منظور کی مگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کشمیر میں ہندوستانی فوجیں بھیج دیں۔ مجاہدین نے ان فوجوں کے ساتھ مقابلہ کیا اور انہیں زبردست نقصان پہنچایا۔

کشمیر کا کچھ حصہ رضا کاروں نے بھارتی قبضے سے چھڑا لیا جسے آزاد کشمیر کہا جاتا ہے وہاں آزاد کشمیر حکومت قائم ہے مگر کشمیر کا بڑا حصہ بھارت نے نہ چھوڑا۔ قائداعظم نے کشمیر سے بھارتی قبضہ چھڑانے کی بہت کوشش کیں۔ سلامتی کونسل نے 7 مئی 1948ء کو کشمیری باشندوں کو آزادانہ استصوابِ رائے کا حق دے دیا۔ مگر افسوس ناک امر یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک متعدد کوششوں کے باوجود بھارت اُسے چھوڑنے پر راضی نہیں ہوا اور بڑی ڈھٹائی سے کشمیر کو اپنا "اٹوٹ انگ" (نہ ٹوٹنے والا حصہ) قرار دیتا ہے۔

مہاجرین کی آبادکاری: لاکھوں مہاجرین ہندوستان کے مختلف علاقوں سے اپنا گھر بار کھیت کھلیان، اپنے گاؤں، اپنے شہر چھوڑ کر پاکستان کا رُخ کرنے پر مجبور کر دیئے گئے۔ وہ لٹے پٹے اور پریشان حال لوگ تھے جو بمشکل اپنی جانیں بچا کر صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ بیشتر مہاجرین عورتیں، بچے بوڑھے اور جوان ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں مارے گئے اور وہ اپنی منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی شہید کر دیئے گئے۔

قائداعظم نے ان کی آبادکاری کے لئے موثر اقدامات کیۓ۔ مہاجرین کے لئے الگ وزارت قائم کی۔ کراچی میں خود اس کام کی نگرانی کی اور پنجاب کا کام لیاقت علی خان کو سونپا۔ قائداعظم مہاجر کیمپوں میں جا کر اُن کی حوصلہ افزائی فرماتے اور یہاں پہلے سے بسنے والے لوگوں کو انصار قرار دیتے اور اُن کو مہاجرین کی مدد کی تلقین کرتے۔ رفتہ رفتہ مہاجرین کے زخم مندمل ہو گئے اور وہ اپنی صلاحیتوں سے اس ملک کی تعمیر و ترقی میں پورے جوش سے مصروفِ عمل ہو گئے۔

☆☆☆

بقیہ صفحہ 31

شرمیلا بوس: 1971ء کی جنگ میرے ساتھ اس وقت سے ہے، جب میں ایک بچی تھی اور کلکتہ میں بڑی ہو رہی تھی (شرمیلا بوس 1971ء میں بارہ سال کی تھیں) میری اپنی یادداشت میں اب تک وہ تکلیف دہ اور پیچیدہ واقعات موجود ہیں، جو ہمارے بالکل نزدیکی شہر میں پیش آئے۔ میرے خاندان کے کئی افراد مشرقی پاکستان سے آنے والے مہاجرین کے لئے امدادی سرگرمیوں میں شامل رہے، مراد یہ ہے کہ یہ واقعات میرے ساتھ اس وقت سے بھی تھے، جب سے میں نے بین الاقوامی سیاست میں دلچسپی لینی شروع کی۔ مجھے ہمیشہ احساس رہتا تھا کہ مجھے اس بارے میں کچھ لکھنا چاہیئے۔ یہ اور بات کہ مجھے اس کا موقع واقعے کے تیس، پینتیس سال بعد جا کر ملا۔

س: آپ کے خیال میں آج کے بنگلہ دیش اور پاکستان کی کتاب کے مندرجات کا وزن کیسے تولا جائیگا؟

شرمیلا بوس: کتاب کے مندرجات بہت مناسب ہیں، مگر بنگلہ دیش اور پاکستان دونوں میں ایسے لوگ ہوں گے، جنہیں اس کتاب پر یقین کرنے اور سمجھنے میں دشواری ہوگی۔ ایسا اس لئے کہ چالیس برس کے دوران دونوں ملکوں میں بھی اپنے طور پر ایک قوم پرستی پر مبنی دیومالا تشکیل پا چکی ہے۔ اس جنگ کے بارے میں کوئی غیر جذباتی، غیر جانب دار اور منظّم ریسرچ نہیں ہوئی، ہم میں سے اکثر لوگ ایسی کہانیاں سنتے ہوئے بڑے ہوئے ہیں۔ میں خود بھی اس کہانی کا وہی بیانیہ سن کر بڑی ہوئی ہوں، جس پر بھارت اور بنگلہ دیش کی چھاپ تھی۔ جب میں نے یہ ریسرچ شروع کی اس وقت میں خود بھی نہیں جانتی تھی کہ کیا نتائج سامنے آئیں گے۔

میرا خیال تھا کہ چونکہ 1971ء کے واقعات مکمل طریقے سے تحریری شکل میں نہیں لائے گئے، اس لئے میں ایسی تفصیلات معلوم کروں جو کہیں درج نہیں ہوئیں، یعنی دستاویزی حقائق کا خود بھی جائزہ لوں۔ لیکن جب میں نے تحقیق کے لیے لوگوں سے بات کرنی شروع کی، تو جو حقائق میرے سامنے آئے، وہ ان کہانیوں سے مختلف تھے، جنہیں سن کر میں بڑی ہوئی تھی۔

میں سمجھ سکتی ہوں کہ بنگلہ دیش اور پاکستان میں بھی لوگوں کو اس کتاب کو سمجھنے میں دشواری پیش آئے گی۔ جو اپنے اپنے وطن کی قوم پرستی پر مبنی کہانیاں سن کر بڑے ہوئے ہیں۔ ایسا ہر جنگی تنازعے کے بعد ہوتا ہے لیکن وہاں یہ ریسرچ پہلے سامنے آنی چاہیئے تھی۔ پھر بھی مجھے خوشی ہے کہ یہ کام مکمل ہوا۔

سانحہ مشرقی پاکستان پر نئی تحقیق

غزالہ عزیز

بھارتی بنگال کے سب سے بڑے شہر کلکتہ سے تعلق رکھنے والی ڈاکٹر شرمیلا بوس، ہندوستان کی تحریک آزادی کے رہنما سبھاش چندر بوس کی پوتی ہیں۔ شرمیلا بوس بھارتی صحافی اور یونیورسٹی آف اوکسفورڈ کے شعبہ سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات کی سینئر ریسرچ ایسوسی ایٹ بھی ہیں۔ پچھلے دنوں ان کی کتاب "Dead Reckoning Memories of the 1971 Bangladesh War" شائع ہوئی، جس نے بھارت اور بنگلہ دیش کے متعصب پاکستان دشمن اسکالرز کو ہلا کر رکھ دیا۔

حسبِ روایت انہوں نے شرمیلا بوس کو پاکستانی ایجنٹ اور بنگال دشمن کے القابات سے نوازنا شروع کر دیا۔ اس سب کی وجہ کتاب مین شرمیلا کا غیر جانبدارانہ رویہ اور ناقابل تردید ثبوت کی بنیاد پر بات کرنا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ شرمیلا کی تحقیق کے مطابق بنگلہ دیش کے حوالے آج تک بھارتی انٹیلی جینس "را" اور دیگر بھارتی میڈیا نے جو پروپیگنڈہ کیا تھا، وہ بالکل یک طرفہ تھا۔ جب کہ زمینی حقائق یہ ہیں کہ اس قتل و غارت گری کے پس پردہ صرف اور صرف بھارتی حکومت کی چالبازی تھی۔ جس نے مکتی باہنی کے نام سے جرائم پیشہ اور ورغلائے گئے بنگالی مسلمانوں کی ایسی فوج تیار کی، جس نے "را" کے منصوبے کے مطابق پاکستانی فوج کے خلاف جان بوجھ کر اشتعال انگیز کارروائیاں کیں۔ غیر بنگالی پاکستانیوں کا قتل عام کر کے پاکستانی فوج کو جوابی کارروائی پر مجبور کیا۔ اس کتاب میں شرمیلا بوس نے ثابت کیا کہ پاکستانی فوجیوں کی طرف سے بنگالی عورتوں کے زنا بالجبر واقعات بڑھا چڑھا کر افسانوی انداز میں پیش کیے گئے۔

انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا کہ بنگالی قوم پرست شدید نوعیت کے انسانیت سوز جرائم میں ملوث تھے۔ انہوں نے ذرائع ابلاغ کی ان اطلاعات کا جائزہ بھی لیا تھا جن میں کہا گیا تھا کہ پاکستانی فوج نے تیس لاکھ بنگالیوں کو قتل کیا۔ انہوں نے اس تعداد کو محض من گھڑت افسانہ قرار دیا اور کہا ہے کہ اتنی بڑی ہلاکتیں کسی سطح پر بھی ثابت نہیں کی جا سکیں۔ حتیٰ کہ کسی بنگلہ سرکاری رپورٹ میں اس تعداد کا حوالہ یا ثبوت تک موجود نہیں۔

شرمیلا نے لکھا کہ سابق مشرقی پاکستان میں 1971ء کی خانہ جنگی کی داستان فاتح فریق یعنی بنگالی قوم پرستوں کی طرف سے بیان کی گئی ہے۔ جس نے نام نہاد مظالم کا جھوٹا پروپیگنڈا کر کے ساری دنیا کو طویل عرصے تک الو بنا کر رکھا۔ ان کی کتاب "ڈیڈ ریکنگ" (یعنی مردوں کا شمار) کے مطابق بنگالی قوم پرستوں کی بغاوت، مشرقی پاکستان میں غیر بنگالیوں کے خلاف ناقابلِ برداشت تشدد میں تبدیل ہوگئی۔ مغربی پاکستان کے شہریوں اور ان میں بھی زیادہ تر اردو بولنے والوں کو نشانہ بنایا گیا، جو تقسیمِ ہند کے وقت بھارت سے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان آئے تھے اور جنہیں بہاری کیا جاتا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ بنگالی قوم پرستی کے نام پر ہونے والی نسلی تشدد میں غیر بنگالی مرد عورتوں اور بچوں کی ہلاکتیں جنگ کے دوران اور اس کے دس ماہ بعد تک ہوتی رہیں۔ نسل پرست قتل عام کا شکار ہونے والے غیر بنگالیوں کو سینکڑوں اور بعض واقعات میں ہزاروں کی تعداد میں قتل کیا گیا۔ قتل عام میں کوئی تخصیص نہ رکھی گئی، نہتے لوگوں کو انتہائی حیوانیت کے ساتھ قتل کیا گیا۔

ڈاکٹر شرمیلا کہتی ہیں کہ بدترین مظالم تو بنگالی علیحدگی پسندوں نے اپنے ہی لوگوں پر ڈھائے تھے۔ آخری دنوں میں حکومت کے حامیوں کے ہاتھوں آزادی کے حامیوں کی ہلاکتیں بدترین جرم تھا اور اب جو کچھ ہو رہا ہے، وہ بھی اچھا نہیں ہو رہا۔

ڈاکٹر شرمیلا چندبوس کی یہ شہادت بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اول وہ بھارت کے آزادی کے رہنما سبھاس چندر کی پوتی ہیں۔ دوم وہ بنگالی ہیں اور سوم ہندو بھی ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس کتاب کے سلسلے میں ان کو قوم پرستوں کے

مشکل سوالات اور جذبات کا سامنا کرنا پڑا۔ واشنگٹن کے ورڈ ولسن انٹرنیشنل سینئر فار اسکالرز کی تقریب جو مارچ 2011ء میں ان کی کتاب کا تنقیدی تعارف پیش کرنے کے لئے منعقد کی گئی۔ اس میں پہلا سوال ان سے یہ کہا گیا کہ "یہ کتاب لکھنے کے لئے آپ نے کس سے پیسے لئے تھے؟" جس کا جواب انہوں نے خندہ پیشانی اور اطمینان کے ساتھ دیا کہ "نہیں، میں نے یہ کتاب لکھنے کے کسی سے کوئی پیسے نہیں لیے"۔ ذیل میں ہم ڈاکٹر شرمیلا بوس کا وہ انٹرویو پیش کر رہے ہیں، جو انہوں نے وائس آف امریکہ کو دیا تھا۔ ان کے بقول "اس تنازع میں کسی فریق کا کردار قابلِ تعریف نہیں"۔

وائس آف امریکہ سے تیکھی گفتگو

س: اس کتاب پر تحقیق کے لئے آپ نے کتنے لوگوں سے بات کی اور وہ کون لوگ تھے؟

شرمیلا بوس: بنگلہ دیش میں، میں نے ایسے بہت سے لوگوں سے بات کی، جو 1971ء کے ان واقعات میں کسی نہ کسی طرح شامل تھے یا ان کے عینی شاہد تھے، جن کے بارے میں، میں تحقیق کر رہی تھی۔ میرے انٹرویوز جن کا ذکر میری کتاب میں ہے، بنگلہ دیش کے دیہاتوں، شہروں اور کئی اضلاع میں جا کر کیے گئے۔ میں نے ان واقعات کا بھی جائزہ لیا جو دسمبر 1970ء سے جنوری 1972ء تک کے ہیں۔ وہ سب لوگ جو وہاں خود موجود تھے اور عینی گواہ تھے۔ آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ یہ کتنی بڑی تعداد ہوگی۔ پاکستان میں، میں نے کوشش کی کہ ایسے افراد سے بات کروں، جو 1971ء میں مشرقی پاکستان میں تعینات مغربی پاکستان کے حاضر سروس جونیئر آرمی آفیسرز تھے، جنہوں نے مشرقی پاکستان میں مارشل لاء کی ڈیوٹی کی۔ شرپسند عناصر کے خلاف کارروائیاں کیں۔ میں کچھ سینئر فوجی افسران سے بھی ملی۔ خوش قسمتی سے میں نے جنرل اے کے نیازی کی موت سے پہلے ان سے بھی ملاقات کی۔ میں نے صاحبزادہ یعقوب خان سے بھی ملاقات کی تھی۔ لیکن زیادہ تر میں نے ان لوگوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کی، جو اس وقت پاکستانی فوج میں کیپٹن یا میجر کے طور پر تعینات تھے یا کچھ رجمنٹ کمانڈر آفیسر تھے اور اب تک حیات ہیں۔ مجموعی طور پر میں نے تین درجن سے زیادہ پاکستانی آرمی آفیسرز سے بات کی۔

بنگلہ دیش میں جن لوگوں سے میری بات ہوئی ان کی گنتی کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ جب دیہی علاقوں میں آپ لوگوں کے انٹرویوز کر رہے ہوتے ہیں، تو اکثر سیکڑوں لوگ یوں ہی جمع ہو جاتے ہیں۔ ایک سے بات کرو تو کئی اور لوگ بھی گفتگو میں حصہ لینے لگتے ہیں اور اپنے تجربات بیان کرنے لگتے ہیں۔

س: پاکستان کے مشرقی اور مغربی حصے کی علیحدگی مین آپ پاکستانی فوج کا کیا کردار دیکھتی ہیں اور بھارت کے کردار کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

شرمیلا بوس: یہ کتاب بھارت کے کردار کے بارے میں نہیں ہے، اگرچہ بھارت کا اس واقعے میں بہت کردار رہا ہے، لیکن میری کتاب ان لوگوں کے بارے میں سے جو اس تنازعے سے براہ راست متاثر ہوئے۔

پاکستانی فوج کا جہاں تک تعلق ہے، وہ اس سال کے دوران ریاست کی پالیسی کے اطلاق کا ذریعہ تھی۔ گو وہ ریاستی پالیسی کے اطلاق کا ذریعہ مارچ 1971ء کے بعد بنی، جب کہ میری کتاب اس سے کچھ مہینے پہلے سے شروع ہوتی ہے۔ مگر پاک فوج نے کیا کیا؟ یہ ایک پیچیدہ معاملہ رہے گا۔ فوج میں ایسے لوگوں تھے جو شرپسندوں کے خلاف نہایت ہی مشکل حالات میں ہر ممکن طریقے سے کارروائیاں کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور جنگ کے ضابطہ اخلاق پر عمل کر رہے تھے۔ ان میں کئی اچھے اور معتبر لوگ تھے، جو شاید اپنے ملک کی پالیسی سے مکمل طور پر اتفاق نہ کرتے ہوں، مگر وہ کام کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو انہیں کرنے وہاں بھیجا گیا تھا۔ تاہم ایسے لوگ بھی تھے، جنہوں نے جنگی جرائم کئے، 1971ء کے تنازعے میں کئی پیچیدگیاں ہیں۔ اس میں ملوث تمام اداروں، فریقوں اور کرداروں کی طرف سے میری کتاب کا سب سے بڑا کنٹری بیوشن یہ ہوگا کہ ان تمام پیچیدگیوں کے بارے میں بات چیت اور مکالمہ شروع کیا جائے۔ تمام لکھنے والوں اور ریسرچ کرنے والوں کو اس بات پر غور کرنا چاہئے، کیونکہ "قوم پرست دیومالائی قصوں" (Nationalistic Mithology) میں واقعات اور چیزوں کو ضرورت سے زیادہ سادہ بنا کر پیش کیا جانا ہے اور اس تنازعے کے دونوں سروں پر کھڑے فریقوں نے ایسا ہی کیا۔

س: بنگلہ دیش کی پیدائش کی کہانی میں آپ ولن کے طور پر کس کو دیکھتی ہیں؟

شرمیلا بوس: مجھے ڈر ہے کہ اس کہانی میں کوئی اچھا کردار نہیں ہے۔ اس تنازعے کے ہر سرے پر برے لوگ بھی موجود تھے اور اچھے لوگ بھی تھے۔

س: وہ کیا چیز تھی جس نے آپ کو تاریخ کے ایسے واقعات کی تحقیق پر اکسایا، جو چالیس سال پہلے ہوئے تھے؟ جب کہ آج کی نسل کے پیش تر لوگ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ کیوں آپ کو یہ خیال آیا کہ بنگلہ دیش کے کہانی کی مضمرات کو گہرائی میں جا کر دیکھنا ضروری ہے؟

بقیہ صفحہ 29 پر

تصورِ پاکستان کی ارتقائی تاریخ

برصغیر میں دوقومی نظریے کی بنیادیں جدید نہیں بڑی قدیم ہیں

سید عاصم محمود

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ قرارداد لاہور دوقومی نظریئے یا تصور پاکستان کا آغاز ہے۔ مگر یہ سمجھنا کہ اس سے پیشتر مسلمانوں نے اپنی الگ ریاست کا خواب کبھی نہیں دیکھا، تاریخ کو مسخ کرنے کے مترادف ہے، تصور پاکستان (یا دوقومی نظریے یعنی مسلمانوں کے لئے الگ وطن) کی جڑیں اس وقت سے وابستہ ہیں جب مسلمان محمد بن قاسم کی ہمراہی میں پہلی مرتبہ وارد ہوئے۔ بقول قائداعظم "پاکستان اسی دن وجود میں آ گیا جب ہندوستان میں پہلے ہندو نے اسلام قبول کیا تھا"۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمہ توحید ہے وطن نہیں اور نہ ہی نسل۔

ہندوستان کا جب پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ ایک جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا اور ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آ گئی۔ پاکستان کا تصور قرارداد لاہور کی رو سے یکایک رونما نہیں ہوا بلکہ یہ باقاعدہ طور پر صدیوں کی مسلمانوں کی اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی جنگ کے دوران رفتہ رفتہ ارتقا پذیر ہو کر ناگزیر ضرورت کے طور پر سامنے آتا رہا۔ ایک نظر اس کے تاریخی ارتقاء اور پس منظر پر بھی ڈالتے چلیئے۔

7112: محمد بن قاسم کی قیادت میں ہندوستان میں مسلمانوں کا دور

1600ء تا 1857ء: شیخ احمد سرہندی (وفات 1625ء) شاہ ولی اللہ (وفات 1766ء) ٹیپو سلطان (وفات 1799ء) اور سید احمد شہید (وفات 1831ء) کی اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لئے تحریکیں

1857ء: کھلا انقلاب، ایسٹ انڈیا کمپنی کو برصغیر میں ریاستی اقتدار جمانے کی اجازت نہ دی جائے۔

1858ء: جان برائٹ نے برطانوی پارلیمنٹ میں ایک بل پر بحث کرتے ہوئے کہا "ہندوستان جیسے وسیع وعریض علاقے میں جہاں مختلف قومیں اور زبانیں ہیں، ایک متحدہ اور پائیدار سلطنت قائم نہیں کی جا سکتی"۔

1879ء: جمال الدین افغانی نے ایک ایسی اسلامی جمہوریہ قائم کرنے کی تجویز کی جس میں وسطی ایشیاء کے اسلامی ممالک، افغانستان اور برصغیر کے مسلمان اکثریت کے علاقے شامل ہوں۔

1883ء: سرسید احمد خان نے کہا "ہندوستان ایک ملک نہیں یہ براعظم ہے اور یہاں مختلف نسلوں اور مختلف روایات کے لوگ آباد ہیں"۔ سرسید نے 1887ء میں ہی واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ یہاں وہ بڑی قومیں آباد ہیں، ہندو اور مسلمان۔

1884ء: سرجان سٹریچی "ہندوستان نہ ایک ہے، نہ کبھی ایک تھا، برطانوی راج سے جو اتحاد پیدا کیا گیا ہے وہ محض مصنوعی ہے اور ع اس سے کبھی ایک متحد قومیت جنم نہیں لے سکے گی"۔

1890ء: مولانا عبدالحلیم شرر۔ "بہتر ہوگا کہ ہندوستان کو ہندو اور مسلمانوں صوبوں میں تقسیم کر کے تبادلہ آبادی کر لیا جائے"۔

1899ء: تھیوڈور ماریسن۔ "برصغیر کی پوری آبادی کو آگرے سے لے کر پشاور تک کے علاقے میں مجتمع کیا جائے"۔

1917ء: اشتراکیت کی بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ سٹاک ہام میں ڈاکٹر عبدالجبار خیری اور ان کے چھوٹے بھائی پروفیسر عبدالستار خیری نے ایک تحریری بیان میں برصغیر کو مسلم اور ہندو ریاستوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ پیش کیا۔

1920ء: محمد عبدالقادر بلگرمی نے گاندھی جی کے نام ایک کھلا خط لکھا جس میں ہندوستان کو مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین تقسیم کرنے والی تجویز کی حمایت کی۔

1921ء: مولانا حسرت موہانی نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ احمد آباد میں اپنے اس شبے کا اظہار کیا کہ حکومت خود اختیاری قائم ہونے

پر ہندو اپنی عددی اکثریت کے بل پر سیاسی اقتدار کو مسلمانوں کو کچلنے کے لئے استعمال کریں گے۔

تین سال بعد مولانا موصوف نے مسلمان اکثریتی صوبوں کو مسلمان ریاستوں میں اور ہندوا کثریتی صوبوں کو ہندو ریاستوں میں بدلنے کا منصوبہ پیش کیا۔

1923ء: بھائی پر مانند، مشہور ہندو رہنما۔۔"ہندوستان کو اس طریقے سے تقسیم کیا جاسکتا ہے کہ ایک خطے میں اسلام کو برتری حاصل ہو اور دوسرے خطے میں ہندو مت کو"۔

1924ء: لالہ لاجپت رائے، مشہور ہندو رہنما نے چون وچرا کے بعد ہندوستان کی تقسیم کا ایسا منصوبہ پیش کیا جس کے مطابق انہوں نے قبول کرلیا کہ مسلمانوں کو شمالی مغربی سرحدی صوبہ مغربی پنجاب، سندھ اور مشرقی بنگال دے دیا جائے۔

1924ء: سردار گل خان، صدر انجمن اسلامیہ، ڈیرہ اسماعیل خان۔۔"راس کماری سے آگرے تک کا پورا علاقہ ہندوؤں اور آگرے سے پشاور تک مسلمانوں کو دیا جائے"۔

1925ء: مولانا محمد علی جوہر نے برصغیر کے شمالی خطوں کے لوگوں کیلئے اقتصادی، فوجی، مذہبی اور تمدنی وجود اسباب کی بنا پر حق خود ارادیت اور علیحدگی کی حمایت کی۔

1925ء: ولیم آرچی بالڈ، پرنسپل ایم اے او کالج، علی گڑھ نے شمال مغربی علاقے اور افغانستان کے مضبوط مسلم اتحاد کی پیش بینی کی۔

1928ء سر آغا خان۔۔جب ہندوستان غیر ملکی تسلط سے آزاد ہو جائے گا تو اس کی وحدانی غیر وفاقی حکومت نہیں ہوسکتی، شمال مغرب اور مشرق کے مسلمان اپنی مرضی کی آزاد ریاستیں بنائیں گے"۔

1929ء: نواب سردار ذوالفقار علی خان، صدر مجلس استقبالیہ آل انڈیا خلافت کانفرنس۔۔"مسلمانوں کو بجائے حقوق کے ایک جداگانہ ملک اور وطن کا مطالبہ کرنا چاہئے"۔

1930ء: علامہ اقبال، خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم لیگ الہ آباد۔۔۔"بہتر ہوگا کہ پنجاب، شمالی مغربی سرحدی صوبے۔ سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک مملکت بنائی جائے جو سلطنت برطانیہ کے اندر یا باہر حکومت خود اختیاری رکھتی ہو"۔

1933ء: کیمرج کے ایک طالبعلم چودھری رحمت علی نے ایک انگریزی پمفلٹ بعنوان "اب یا کبھی نہیں" شائع کیا جس میں لفظ پاکستان پہلی مرتبہ استعمال کیا گیا۔ پی پنجاب سے، اے افغان صوبے سے، کے کشمیر سے، ایس سندھ سے اور تان بلوچستان کے آخری حروف سے اخذ کر کے یہ اصطلاح وضع کی گئی، چودھری صاحب نے پمفلٹ، کتابچے، دستی اشتہار اور دیگر لٹریچر شائع کر کے "پاکستان" قائم کرنے کی تحریک چلائی۔

1938ء: قائداعظم کے زیرِ صدارت منظور شدہ قرار داد سندھ صوبائی مسلم لیگ۔۔"ہندوستان کو دو وفاقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، یعنی مسلم ریاستوں کا وفاق اور غیر مسلم ریاستوں کا وفاق"۔

1939ء: چودھری خلیق الزمان اور عبدالرحمٰن صدیقی لندن گئے تو وفاقی وزیر ہند اور کرنل موئر ہیڈ سے اپنی ملاقاتون کے دوران میں تقسیم کی تجویز پیش کی۔

38-1939ء: ان دو برسوں میں مختلف حضرات نے مسلم خطوں اور جداگانہ آزاد ریاستوں کے قیام کی تجویزیں پیش کیں، جن میں ڈاکٹر عبدالطیف (حیدر آباد)، سر سکندر حیات خان (پنجاب)، میاں کفایت علی، ڈاکٹر سید ظفر الاحسن اور ڈاکٹر ایم افضل قادری (علی گڑھ) کی پیش کردہ تجاویز کو نسبتاً زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

1939ء: قائداعظم نے 8 اپریل کو مسل لیگ کونسل سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا"اس وقت کئی منصوبے اور تجویزیں ہمارے سامنے ہیں جن میں ملک کو تقسیم کرنے کی تجویز شامل ہے۔ یہ مسئلہ مجلس عمل کے زیرِ غور ہے۔ پورے مسئلے کا جائزہ لے کر ایسی سکیم پیش کی جائے گی جو مجلس عمل کے نزدیک مسلمانانِ ہند کے بہترین مفاد میں ہو"۔

1940ء: اس فیصلے کے دو روز کے بعد 6 فروری کو قائداعظم نے وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو سے ملاقات کی اور بتایا کہ مسلم لیگ اپنے لاہور والے کھلے اجلاس میں ملک کی تقسیم کا مطالبہ کرنے والی ہے۔ اس تاریخی پس منظر میں دیکھیں تو بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ "قرارداد لاہور" دوقومی نظریے کی اساس تو ہے مگر آغاز نہیں بلکہ اس نظریے کے بتدریج ارتقاء کا اختتام تھی۔ اب گویا نظریہ بااصولی عملی جامہ پہننے کے لئے (اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ) بالکل تیار اور پختہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

پروفیسر سرور خان نیازی کا ناول "کچہ" مختصر جائزہ

محمد خان نیازی، اسلام آباد

مشہور مورخ، محقق اور ادیب کنہیالال کپوُر نے ایک دفعہ ایک مضمون میں لکھا تھا مجھے دیوندر ستیارتھی کی ڈاڑھی، میرا جی کی زلفیں اور ناشر کتب چوہدری نذیر احمد کی قسمیں بہت پسند ہیں۔ بالکل اسی طرح مجھے بھی پروفیسر سرور خان نیازی کے عظیم ناول "کچہ" میں میانوالی کی ٹھیٹھ بولی کے دلنشیں الفاظ کو سموئے اردُو زبان، اَتّو کملے کا کردار اور جا بجا انگریزی ادب کی خوشہ چینی و چاشنی سے لبریز مکالمے بہت پسند ہیں۔ میرا تعلق چونکہ میانوالی کی دھرتی سے گہرا ہے اس لیے میں اس ناول کی زبان میں موتیوں کی طرح پروئے میانوالی کے مقامی الفاظ سے اس طرح لطف اندوز ہوا جیسے کوئی خالص پنجابی، مستنصر حسین تارڑ کے معروف ناول "راکھ" کی پنجابی میں لتھڑی اردُو زبان سے ہوتا ہے۔ اب کچے کا باسی جب بات کرے گا تو ظاہر ہے اُس میں حقیقت کا رنگ تو تبھی آئے گا جب وہ ٹھیٹھ ماں بولی میں مافی الضمیر بیان کرے گا۔ مثال کے طور پر یہ جملہ "جھَوٹے کی لِیک مار کر کھال اُتار رہے ہیں" ملاحظہ فرمائیں۔ قاری کا تعلق اگر میانوالی سے ہے تو پھڑک اُٹھے گا وگرنہ یقیناً یہ جملہ اُس کے سر کے اوپر سے یوں گزر جائے گا جیسے مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب "غبارِ خاطر" کے دقیق فارسی اشعار اردو خواں طبقوں کی طبائع نازک پر گراں گزرتے ہیں۔ شاید اسی انداز کے بوجھل پن کو محسوس کرتے ہوئے اردُو کے صاحبِ طرز ادیب مختار مسعود کو یوں لکھنا پڑا تھا:

"مولانا ابوالکلام آزاد تو نثر کا آرائشی فریم اپنے پسندیدہ فارسی اشعار کو ٹانکنے کے لیے بناتے ہیں۔ اُن کے اشعار بے محل نہیں ہوتے ملحقہ نثر بے محل ہوتی ہے۔ وہ اپنی نثر کا تمام تر ریشمی کوکون اپنے ادبی لُعابِ دہن سے فارسی شعر کے گِرد بُنتے ہیں"۔

یہاں مگر جو میانوالی کی پرانی تہذیب کی کہاوتیں "ما، ماسی کندھ ایرے تے آسی" بہت سے فراموش شدہ الفاظ و محاورے مثلاً "بُلھنڑ (ڈولفن)، گُتاوا، چھُڑک، گالا، واڑکا، مُنڈھی ماردی، چٹے مارے، چوتے کی پکی ہے، پھِٹا تھیویں" جیسی چند مثالیں 'مُشتے نمونہ از خروارے' کے طور پر پیش کی گئی ہیں اس ناول میں بالکل بھی بے محل نہیں ہیں بلکہ ان کا استعمال انتہائی بے ساختگی، برجستگی، سادگی و پُرکاری کا انداز لئے ہوئے ہے۔ البتہ ایک بات میں ضرور کہوں گا کہ یہ ناول گو میانوالی کی ثقافت و تاریخ کے دھڑّے پر دھِیرے دھِیرے گھومتا محسوس ہوتا ہے لیکن یہ سفر کرتا ہوا پاک و ہند کی سرحدوں سے پار دنیا کے کونے کونے میں اردُو سمجھنے والوں کے دلوں تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جب یہ اُن قاریوں تک پہنچے گا تو اُن کو "غبار خاطر" کے فارسی اَشعار کی طرح میانوالی کی ماں بولی اس ناول سے صحیح معنوں میں لطف اندوز ہونے میں مانع تو ہوگی مگر خواجہ غلام فرید کی سرائیکی کافیوں کی طرح دلوں پر اثر انداز ضرور ہوگی۔ اس کا ایک آسان حل تو یہ ہے کہ کوئی میانوالی کا نوجوان اُٹھے اور ایسے تمام الفاظ چُن چُن کر الگ کر کے ایک فرہنگ بنائے اور ان الفاظ، محاورات و ضرب الامثال کے معانی و مفاہیم لکھ کر ناول کے آخیر میں کتاب کا حصہ بنا دے بعینہٖ جیسے "غبارِ خاطر" کے نئے ایڈیشن میں تمام فارسی اَشعار کا مآخذ، ترجمہ و تصحیح احسن طریقے سے شامل کیے گئے ہیں۔

ناول کی کہانی کی تلخیص ایک تو دریا کو کُوزے میں بند کرنے کے مترادف ہوگا دوسرا جس طرح شعر کا حسن شعر میں ہی ہوتا ہے مفہوم بیان کرنے سے شعر کا لطف جاتا رہتا ہے۔ اسی طرح ناول کی کہانی بیان کر کے مضمون کو طویل تر تو کیا جا سکتا ہے، حظ نہیں اٹھایا جا سکتا البتہ اس کہانی کے حسن و قبح پر بات کی جا سکتی ہے اور میں تو انہی خطوط پر تبصرہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یہ ناول بظاہر موجودہ جناح بیراج اور چشمہ بیراج کے درمیانی علاقے کی کہانی ہے مگر اس نے پورے میانوالی کی ثقافت و روایات کا احاطہ کیا ہُوا ہے۔ خوشحال گڑھ سے کالا باغ تک دریائے سندھ پہاڑوں کے بیچ زیادہ سے زیادہ ایک بپھری ہوئی ندی کی صورت بہتا ہے لیکن اس کے بعد عیسیٰ خیل سے تری خیل کے درمیان میلوں تک پھیل کر نیم جان سا ہو کر مشرق سے مغرب کے درمیان کروٹیں لیتا ہے اور یہی دریا اپنے سردیوں گرمیوں کے رنگوں سمیت کچہ وسیب کے لوگوں کی تہذیب و ثقافت کا محور بھی ہے اور محبوب بھی۔ اسی طرح کہانی کے حالات و واقعات سے زمانے کا تعیّن کروں تو 1947ء میں پاکستان بننے کے بعد سے شروع ہو کر 25 مارچ 1971ء کو چشمہ بیراج کے گیٹ بند کر کے جب مشہور فرانسیسی کمپنی ڈومیز اینڈ

بوری & BorieDumez)اس پروجیکٹ کے کامیاب افتتاح کی خوشیاں منا رہی تھی تو یہ کہانی ایک دُکھ بھرے انجام کو پہنچ رہی تھی جس میں حکومت کی طرف سے لوگوں کو اپنے اجداد کی قبریں، پُرکھوں کی یادیں، زمینیں، اپنے گھر بار بلکہ پوُری تہذیب کو جلد از جلد چھوڑ دینے کے اعلانات تواتر سے ہو رہے تھے۔ پورے ناول میں کسی مقامی ہندو کا کردار نہیں اور جہاں ہے بھی وہ ایک مہاجر ہندو کا ہے جو ہندوستان میں مقیم ہے اور اب بھی اپنی جنم بھومی میانوالی سے ماں کی طرح پیار کرتا ہے اور یوں میر یتعیّنِ زمانی کے خود ساختہ مفروضے کو اس کردار سے بھی تقویّت ملتی ہے۔ قیام پاکستان ایک خوبصورت خواب کی تعبیر تھی لیکن فسادات و ہجرت نے ایک بڑے المیے کو جنم دیا پھر 1971ء کا سال بھی ایک دوسرے المیے پر اختتام پذیر ہوا۔ یوں مصنف کی چابک دستی سے مقامی کہانی ایک بڑے انسانی المیے سے دوسرے قومی المیے تک کے احساسات و جذبات کو اپنے دامن میں لپیٹے دریائے سندھ کی موجوں کی طرح برف پوش چوٹیوں سے اترتی، چٹانوں سے ٹکراتی، پتھروں سے اُچھلتی، کئی موڑ مُڑتی اپنے منطقی انجام تک یوں پہنچتی ہے جیسے دریا اپنی ہستی، اپنی مستی، اپنا سب کچھ سندھ ساگر پہ جا کر سمندر کے حوالے کرتا ہے تو اُداسی کی ایک دبیز چادر ماحول پر چھا جاتی ہے اور یہی کیفیّت اس کہانی کے اختتام پر پڑھنے والے کو ملتی ہے۔

مقامی کہانی اُبھے (شمالی) نارو اور لمّے (جنوبی) نارو نامی دیہات سے شروع ہوتی ہے۔ اس ناول میں " گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن" کے مصداق بڑا تنوّع ہے۔ کچے کے علاقے میں اُس زمانے میں پائی جانے والی آبی حیات، پرندوں، جڑی بوٹیوں، فصلوں، حشرات الارض کی پوری کیٹلاگ کو سوزنِ قلم سے ناول کی قمیض پر جا بجا نمایاں مقامات پر ایک ماہر مینا کار کی طرح ٹانک دیا گیا ہے۔ کچے کی عمومی زندگی سردیوں کے دریا کی طرح جمود کا شکار ہے لیکن عیسیٰ خیل کے علاقے سے مجبوراً ہجرت کر کے آنے والے غریب خاندان کی حسین ادھیڑ عمر بھڈی، ماں کے ناک نقشے والی خوبصورت الہڑ مٹیار رانی، انتہائی پڑھے لکھے اعجاز علی صدیقی کے خاندان کی بسلسلہ ملازمت آمد اور ایک تیسرے امام مسجد کے خاندان کا کچے میں ورُود، ہَڑ کے پانیوں کی طرح گاؤں کی زندگی کو اَتھل پتھل کر دیتا ہے۔ پروفیسر صدیقی، چاچا احمد اور اس کا خاندان اگر چراغِ مصطفوی کا استعارہ ہیں تو وہیں ماسٹر قدرت اللہ، اُس کا بھائی نصر اللہ اور اُن کے تمام دوست شرارِ بولہبی کا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ کہانی میں محبتیں ہیں، رومانس ہے، نفرتیں ہیں، عداوتیں ہیں، سازشیں ہیں، سازشوں کا توڑ کرنے والے ہیں، مَکَرُوْا وَ مَکَرَ اللہ کی سنتِ خداوندی کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔ سب کردار بہت جاندار ہیں اور بقول مصنف کچھ تو اتنے آزاد خیال ہیں کہ من مرضی کر لیتے ہیں۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں مگر سب سے زیادہ جیتا جاگتا محرّک اور میانوالی کی قدیم تہذیب و ثقافت کا نمائندہ کردار "اَتُّو کملا" ہے۔ ایسے نیک اور اللہ لوک معاشروں پر رحمت کی بارش کی طرح اُتارے جاتے ہیں مگر بہت کم لوگ اُن کو پہچان پاتے ہیں۔ یہ دیوانوں کی سی ہیئت کذائی میں فرزانگی کی باتیں کرتے ہیں۔ کبھی یہ عید والے دن جب لوگوں سے پوچھتے ہیں، عید کدوں؟ (عید کب ہوگی؟) تو لوگ اُن کا ٹھٹھا اُڑاتے ہیں لیکن وہ بظاہر دیوانہ جب خواجہ غلام فریدؒ سے یہی سوال دہراتے ہیں تو وہ سوال کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ اُس کے مطابق جواب دیتے ہیں "یار مِلے جَدوں" (جب یار ملے تب عید ہوگی)۔ مجذُوب سُن کر بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ کبھی یہ شیخ بہلولؒ کی صورت میں ریت کے گھروندے بنا کر خلیفہ کی بیوی زبیدہ خاتون کو تین درہم میں جنت کے محل کے طور پر بیچ دیتے ہیں۔ خلیفہ ہارون الرشید بیگم کا مذاق اُڑاتا ہے اور خواب میں جنت کا محل دیکھنے کے بعد ایسا ہی سودا اُس کو پوری سلطنت کی قیمت پر بھی درویش بیچنے کو تیار نہیں ہوتا۔ حضرت جنید بغدادیؒ جیسے لوگ ان درویشوں سے کھانے، بولنے اور سونے کے آداب سیکھتے ہیں تو دنیا حیران رہ جاتی ہے۔ یہ اَتّو کملے کبھی دیوانگی کے بھیس میں ہوتے ہیں تو کبھی غربت کے لبادے میں روپوش ملتے ہیں۔ رزقِ حلال، سادگی، انسانوں کی خدمت، کم گوئی اور خودنمائی سے کوسوں دُور یہ لوگ عام انسانوں میں گھُلے ملے رہتے ہیں اور چپ چاپ اپنے اگلے سفر پر یوں روانہ ہو جاتے ہیں کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔ اُن کے لیے ضمیمے چھَپتے ہیں اور نہ جنازوں میں جمِ غفیر ہوتا ہے۔ قسمت والے حق شناس اُن کی قدر کرتے ہیں اور حرام کی کمائی والے بدبخت متکبّر امیر زادے اُن کو حقیر جانتے ہیں۔ اَتّو کملے اس روپّے کی ذرا پرواہ نہیں کرتے۔ اَتّو کملے کا تن اور مَن دونوں نئے لٹھے کی چادر کی طرح اُجلے ہوتے ہیں۔ اس لیے پوری کہانی میں یہ کردار شہد کی مکھی کی طرح نیکی کے پھُولوں کے گرد بھنبھناتا اور بدی کے کرداروں پر پوری طاقت سے حملہ آور ہوتا ملتا ہے۔ معصوم بھڈی اور اُس کی خوبصورت نوجوان بیٹی رانی کو تھانے کی حوالات سے کسی کرپٹ افسر کے بستر کی زینت بننے میں 'اَتّو کملا' سب سے بڑی رکاوٹ بن کے سامنے آتا ہے۔ مجھے بھی تھوڑی سی اجازت دیجیئے کہ اپنی ماں بولی میں ایک جملے کا تبصرہ کرلوں۔ گویا یوں کہا جا سکتا ہے کہ 'اَتّو کملا' ناول کے کرداروں میں ایسے ہے جیسے بٹیروں کے "لاوے" میں "بھیت" ہوتی ہے۔

کہیں پڑھا تھا ضحاک کے کاندھوں پر دو ناگ پھُنپھُناتے رہتے تھے۔ ہر روز ان ناگوں کو دو انسانی کھوپڑیاں خوراک کے طور پر چاہیئے ہوتی تھیں۔ یہ غذا کسی وجہ سے نہ ملتی تو وہ ضحاک پر پھُنکارتے تھے۔ ہمارے محترم استاد پروفیسر سرور نیازی صاحب کے کاندھوں پر بھی دو ایسے ہی کالے ناگ بیٹھے رہتے ہیں۔ انہیں غذا کے نام پر انسانی کھوپڑیوں سے نکلا گوُدا درکار ہوتا ہے جسے کتاب کہتے ہیں۔ پروفیسر صاحب کے ناگ اب تک بہت سے انسانی دماغوں کا خصوصاً انگریزی ادب لکھنے والوں کے دماغوں کا گوُدا لے چکے ہیں اور ہم سب کو معلوم ہے کہ جب پھُولوں اور کونپلوں کا بہت زیادہ رَس چھَتے میں جمع ہو جاتا ہے تو پھر وہ شہد کی صورت میں عوام الناس کی خدمت میں پیش ہو جاتا ہے۔ اس ناول میں بھی جہاں مصنف ہمیں اردو، فارسی، عربی اور مقامی زبانوں پر اپنی مضبوط گرفت کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں، وہیں انگریزی ادب کے بڑے دماغوں کا گوُدا اور مغربی دنیا کے ادبی گلزاروں میں کھلنے والے پھُولوں سے لیے رَس کی مہک جگہ جگہ کہانی کو معطر کرتی مِلتی ہے۔ کیٹس (Keats)، شیکسپیئر (Shakespeare)، چارلس ڈکنز (DikensCharles) ایڈم سمتھ (Adam Smith) کارل مارکس (Carl Mark) جین آسٹن (Jane Austen)، دوستوفسکی (Dostoevsky) اور ان جیسے دیگر عالمی ادبی مشاہیر کی کتابوں کے حوالے انتہائی خوبصورتی سے تحریر میں اور مکالموں میں یوں سموئے ہیں کہ ملتان میں نو وارد درویش یاد آ جاتا ہے۔ وہ یہاں تشریف لائے تو پہلے سے موجود صوفیاء نے اُس کو دُودھ سے لبالب ایک پیالہ پیش کیا وہ رمز آشنا تھا مطلب سمجھ گیا کہ بتایا جا رہا ہے "ملتان پِیروں سے پُر ہے"۔ چونکہ حکم اُس کو بھی اپنے مُرشد کی طرف سے اِسی شہر میں قیام کا ملا تھا لہٰذا اس نے گلاب کی پتی سطح پر رکھی اور پیالہ واپس بھیجوا دیا۔ جواب میں اشارہ تھا میں ملتان میں یوں سما جاؤں گا جیسے یہ پھُول کی پتی لبالب بھرے دوُدھ کے پیالے میں سما گئی ہے۔ یہاں بھی کہانی ان مغربی ادب کے حوالوں سے قطعاً بوجھل نہیں ہوتی بلکہ اس ادبی شہ پارے کے معیار میں اضافے کا موُجب ہے۔ میں نقاد نہیں ہوں، فقط تبصرہ نگار ہوں جسے سات خون معاف ہوتے ہیں تو مجھے ایک جملہ ضرور کہنے دیجئے کہ اگرچہ کچّے میں ہیڈ ماسٹر عطا محمد شاہ اور پروفیسر صدیقی کی صورت اساتذہ کرام و علمی نابغوں نے گلزار بخاری، ستار سید اور عقیل شاہ جیسے قومی سطح کے لکھاری پیدا کیے ہیں مگر پھر بھی ہائی سکول کے نوجوان اور کم آموز طالب علموں کی زبانوں سے جو عموماً انگریزی مضمون پاس کرنے میں بھی دشواریوں کا سامنا کر رہے ہوتے ہیں، روزمرہ کی گفتگو میں ان بہت بڑے انگریزی ادیبوں کی تصنیفات کے حوالے دیتے نظر آتے ہیں تو دماغ میں کچھ کُسک سی ضرور پیدا ہوتی ہے کیونکہ لان جائینس (Longinus) کے فلسفہ کے مطابق کسی بھی تصور کو اگر پُرشکوہ الفاظ میں بیان کیا جائے تو بیانیے کی وقعت ختم ہو جاتی ہے۔

جہاں تک راویوں کی تعداد کا تعلق ہے کوئی دوسرا اردو ناول اس کے مقابل نہیں لایا جا سکتا۔ انگریزی ادب بہت وسیع ہے میں اس کے کامل غوّاص ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور اگر وہاں ایسا ہو تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اردو ادب کے نامور لکھاری شمس الرحمٰن فاروقی کا عظیم ناول " کئی چاند تھے سرِ آسمان" کسی حد تک یہی انداز اپناتا ہے جہاں شروعات ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی ماہرِ امراضِ چشم کی یادداشتوں سے ہوتی ہیں، پھر ایک کردار محمد یحییٰ یوں بات آگے بڑھاتا ہے "نجانے کب کی بات ہے، میں اپنی ماں کے ساتھ خچر پر سوار ہوں"۔ اس کے بعد ایک کردار محمد یوسف کہانی بیان کرتا ملتا ہے مگر عمومی کہانی پرانے قصہ گو کے انداز میں آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اسی لیے خاص تعدّدِ راویان کی ترکیب و ترتیب میں " مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی " کے مِصداق پروفیسر نیازی صاحب کے ناول کو ایک انتہا درجے کی فوقیّت و انفرادیّت حاصل ہے۔ یہاں یہ واضح کردوں کہ میرا مقصوُد دونوں ناولوں کے حسن و قُبح کا کلّی موازنہ کرنا ہرگز نہیں ہے۔

ناول کی ایک خوبی جزئیات نگاری بھی ہوتی ہے یہی چیز ناول کو افسانے یا دیگر اصنافِ ادب سے ممتاز کرتی ہے۔ یہاں فاضل ناول نگار نے کمال ژرف نگاہی سے کام لیتے ہوئے ماسٹر قدرت اللہ کے بٹیروں کی لڑائی کا جو منظر نامہ تیار کیا ہے اس سے پنڈت سرشار کے "فسانہ آزاد" کے معرُوف کردار "خوجی" اور "صف شکن" یاد آتے ہیں۔ میں پورے ایقان سے " کچہ " کو داؤد خیل میں لکھے جانے والے عبداللہ حسین کے شاہکار ناول "اُداس نسلیں" ان کے دوسرے یادگار کام "نادار لوگ"، قراۃ العین حیدر کے شہ پارے " آگ کا دریا" مستنصر حسین تارڑ کی دہکتی آگ سی کہانی " راکھ " شمس الرحمٰن فاروقی کے منفرد ناول " کئی چاند تھے سرِ آسماں " اور شوکت صدیقی کے لاجواب تحفہ " خدا کی بستی " جیسے عظیم اردو ناولوں کی قطار میں رکھے جانے کے قابل ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ مصنف کو اسی معیار کے مزید کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆

نقطۂ نظر

رپورٹ: ڈائریکٹر میڈیا

" ملکی مسائل کے حل میں اہل قلم کا کردار "

نظریہ پاکستان کونسل ٹرسٹ کے زیر اہتمام ایوانِ قائد میں " ملکی مسائل کے حل میں اہل قلم کا کردار " کے موضوع پر ادبی وفکری نشست کا اہتمام کیا گیا جسکی صدارت ٹرسٹ کے چیئرمین میاں محمد جاوید نے کی جبکہ معروف ادیب و دانشور محمد حمید شاہد تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ ڈائریکٹر میڈیا نے ٹرسٹ کے اغراض ومقاصد اور موضوع کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ سیاسی و جمہوری راہنماؤں کے ساتھ ساتھ دراصل اہل قلم کسی معاشرے کے حقیقی راہ نما ہوا کرتے ہیں۔ آج وطن عزیز جن گونا گوں مسائل کا شکار ہے وہ ایک دن میں پیدا نہیں ہوئے۔ معیشت کا اس قدر برا حال ہے کہ عام آدمی کیلئے دو وقت کی روٹی مشکل ہو چکی ہے۔ ان حالات میں اہل علم ودانش پر بھاری ذمہ داری آن پڑی ہے کہ وہ مثبت انداز فکر سے ان مسائل کا حل تلاش کریں اور حکومت وقت کیلئے قابل عمل تجاویز مرتب کریں۔ مثال کے طور پر سینکڑوں میٹرو بسوں پر مربوط انداز میں اشتہاری کمپنیوں کے ساتھ مل کر لینڈ ڈویلپرز اور تعمیراتی و دیگر کمپنیوں کے اشتہارات لگا کر ذرائع آمدن پیدا کیے جائیں۔

سینئر لکھاری فردوسِ عالم نے کہا کہ مسائل کے حل سے قبل حقیقی مسائل کی درست نشاندھی ضروری ہے۔ قران مجید میں قلم کی تقدیس بیان کی گئی ہے، یہ بہت اہم بات ہے اس لئے اہل قلم کو اپنے مقام ومرتبہ کو پہچان کر معاشرے میں بیداری کی تحریک کے ذریعے مسائل کی روح تک پہنچنا ضروری ہے۔ ادیب کا معاشرے کی نبض پر ہاتھ ہوتا ہے۔ اپنے بچوں کی تربیت بھی اہل قلم کو خود ہی کرنی چاہیے تاکہ ہم ایک بہتر معاشرے کی تشکیل کر سکیں۔

ڈرامہ رائٹر افشاں عباسی نے کہا اس وقت اس صورتحال سے سب سے زیادہ اہل قلم متاثر ہو رہے ہیں۔ ایک طرف انہیں بچوں کیلئے رزق حلال کمانے کی فکر ہے اور دوسری طرف اسے احساس کی سولی پر لٹکتے ہوئے آگہی کا درد سہنا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے کاروں کی بجائے بسوں پر سفر شروع کرتے ہوئے پیٹرول بچانا ہے اور ہر اس چیز کی بچت کرنی ہے جس میں زرمبادلہ کی بچت ہو سکے۔ ہمارے پڑھے لکھے لوگ طرح طرح کے احساس کمتری کا شکار ہیں۔ نت نئے فیشنوں کی دوڑ نے زندگی کا سکھ چین چھین لیا ہے۔ ہمیں اپنی اور اہل خانہ کی بے لگام خواہشات کو کنٹرول کر کے غیر ضروری اخراجات کو روکنا ہوگا، دوسری صورت میں معاشرے کو تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

افسانہ نگار سید محمد علی کا کہنا تھا کہ آج کا موضوع بہت اہم ہے۔ ہم یہ باتیں ادبی محافل میں نہیں کر سکتے۔ یہ این پی سی کی فکری نشست کا ہی اعجاز ہے کہ ہم ملکی مسائل زیر بحث لا رہے ہیں۔ وزارت ثقافت میں سرکاری مشینری کا حصہ ہوتے ہوئے میں نے کبھی کسی وزیر یا وفاقی سیکرٹری کو ماہر ثقافت نہیں دیکھا جبکہ ساری دنیا میں "رائٹ مین آن رائٹ جاب" کا اصول ہے۔ پاکستان میں ہر وزارت کے ساتھ اس شعبے کے درجن بھر ماہرین کا گروپ ہونا چاہیے جس کی مرتب کردہ سفارشات پر وزارت یا ڈویژن کام کو درست سمت میں آگے بڑھائے۔

شاعر ودانشور عرفان خان نے کہا کہ اسلام اتحاد اور بھائی چارے کا درس دیتا ہے۔ ہمیں ریاکاری کے بجائے سچ بولنا پڑے گا تاکہ حقیقی مسائل کی نشاندھی کر کے صحیح معنوں میں مسائل کا حل تلاش کیا جا سکے۔ انہوں نے معروف شاعر دوست رانا سعید دوشی کا یہ شعر بھی پڑھا۔

میں چپ رہا تو مجھے مار دے گا میرا ضمیر
میں نے گواہی دی تو عدالت میں مارا جاؤں گا
مرا یہ خون مرے دشمنوں کے سر ہوگا
میں دوستوں کی حراست میں مارا جاؤں گا

ممتاز شاعر ودانشور علی احمد قمر نے کہا کہ اللہ نے خطہ ارضی پاکستان کو ہر نعمت سے نوازا ہے۔ یہاں قیمتی معدنیات سے بھرے پہاڑ، بہتے دریا، سمندر، جنگلی حیات سے لدے جنگل، حد نظر تک پھیلے صحرا و میدان اور لہلہاتے کھیت ہیں۔ پاکستان ایک زرعی ملک تھا مگر ہم نے بہ حیثیت قوم کبھی ان نعمتوں پر رب کا شکر ادا نہیں کیا اور آج ہم ہر شعبے میں ترقی کے بجائے تنزلی کا شکار ہیں۔ ہمیں ان نعمتوں کا شکر ادا کر کے شبانہ روز محنت کر کے اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنا ہوگا۔ ہمارے ہاں نصابی کتب سے محمد بن قاسم، ٹیپو سلطان اور صلاح الدین ایوبی غائب ہو چکے ہیں۔ ہمارے بچے اپنے ہیروز سے نا آشنا ہیں۔ دور حاضر میں چیک اینڈ بیلنس نہیں ہے اور ہر سطح پر منصوبہ بندی کی کمی ہے جس کی وجہ سے آج ہمارے مسائل گھمبیر ہو چکے ہیں۔

اردو ادب کے قاری اور فلاحی ورکر صادق مسعود نے کہا مسلمانوں کی

تاریخ گواہ ہے کہ دولت کے انباروں نے کبھی کسی قوم کی حالت نہیں بدلی۔ ہمیں کردار سازی کی ضرورت ہے۔ جو انبیاءؑ بھیجے جاتے تھے وہ مال و دولت نہیں بلکہ کردار لے کر آتے تھے اور اپنی قوم کی کردار سازی پر زور دیتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ایک سو بہتر اصحاب اکرامؓ نے ایسا انقلاب برپا کر دیا کہ جس کی دنیا کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدینؓ نے دانش، ثروت، شجاعت اور انتظامی صلاحیتوں کی دھاک بٹھا دی۔ ہمارے کسی شاعر کا ایک شعر انقلاب برپا کر سکتا ہے۔ علامہ اقبال کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ دور حاضر میں اہل قلم کا کردار بہت بنیادی ہے۔ انہیں چاہیے کہ وہ ہر حال میں سچ لکھیں، آنے والا وقت انکے سچ کی گواہی دے گا، انشاللہ

ادیب ودانشور ظہیر گیلانی نے کہا یہی سچ ہے کہ لکھا ہوا لفظ امر ہے اور یہ بھی اہم ہے کہ لکھا ہوا وہ لفظ کیا ہے؟ اگر سچ ہے تو معاشرے پر اس کا مثبت اثر ہوگا۔ ہمارے ہاں مذہبی اور سماجی رویے بدل گئے ہیں۔ سیاسی خلفشار بڑھ چکا ہے۔ ایسے میں اخلاقی اقدار مر رہی ہیں۔ ہر شخص پریشان ومضطرب ہے۔ ہم اپنے دین کی طرف لوٹیں گے تو راہ نمائی پائیں گے کہ قرآن مجید واحد آسمانی صحیفہ ہے جس میں سے آج تک کوئی کچھ بھی تحریف نہیں کر سکا۔ اہل قلم کیلئے اس حقیقت کا ادراک ضروری ہے۔ ایسے سنجیدہ موضوعات پر گفت وشنید کیلئے این پی سی کا فورم غنیمت ہے۔ یہاں اہل قلم متحد ہو کر مثبت انداز فکر کے ساتھ اپنی تجاویز مرتب کریں اور ملکی ترقی میں اپنا فعال کردار ادا کریں۔

شاعر وسماجی ورکر سبطین رضا لودھی نے کہا کہ میں سرائیکی ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ موجودہ یا آنے والی حکومت کو سنجیدگی سے سرائیکی صوبہ بنانے کا عمل شروع کرنا چاہئیے تاکہ پاکستان کی تمام اکائیاں مطمئن ہو کر پاکستان کی ترقی وخوشحالی میں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکیں۔

تقریب کے مہمان خصوصی اور معروف شاعر ودانشور محمد حمید شاہد نے کہا کہ قلم تو سب کے پاس ہے مگر ہر قلم کا لکھا ہوا مختلف اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ جج کا قلم زندگی موت کے فیصلے اور انصاف کرتا ہے۔ ڈاکٹر کا قلم شفایابی کے نسخے لکھتا ہے لیکن آج ادیب کو مرکز سے ہٹا کر حاشیے کی جانب دھکیل دیا گیا ہے۔ آج ترقی کی دوڑ نے ہر شئے کو قابل فروخت جنس بنا دیا ہے، جب ہم نے تہذیب بھی بازاری کے ہاتھ میں دے دی ہے تو پھر ادیب اور لکھاری کا سچ کہاں جائے گا؟ بازاری اشتہار دیتا ہے ڈرامہ تو پھر اسکی مرضی سے لکھا جائے گا ناں؟ آج کل دانشوروں کی دانش چوری ہو جاتی ہے اور انہیں پتہ بھی نہیں چلتا۔ بیانیہ بنایا جاتا ہے اور ذہن سازی کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں قومی سطح کا بیانیہ تشکیل دینے کی اشد ضرورت ہے۔ مارکیٹ ہمارے ہاتھ سے نکل رہی ہے۔ دانشور کو کسی بھی سیاسی جماعت کی ترجمانی کی بجائے عوام کا حقیقی ترجمان ہونا چاہئیے۔ علم پہلے لائق تکریم سمجھا جاتا تھا مگر اب برانڈ سمبل بن چکا ہے۔ دانشوروں اور سیاسی مفکرین کو مل کر قومی بیانیہ تشکیل دینا چاہئیے تاکہ نئی نسل کی درست سمت میں راہ نمائی کی جا سکے۔ میں آج کی اس اہم نشست کے انعقاد پر جناب چیرمین آپ کا اور اپنے دوست حمید قیصر کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور پرامید ہوں کہ اس موضوع پر مزید اہل قلم کو بھی گفت وشنید کی دعوت دی جاتی رہے گی۔

چیئرمین این پی سی میاں محمد جاوید نے تمام شرکائے تقریب کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ "نقطہ ءنظر" کے تحت آج کی ادبی وفکری نشست گفت وشنید کے معیار کے اعتبار سے بہت اہمیت کی حامل تھی۔ ہم سب کو ایک دوسرے کا نقطۂ نظر سمجھنے کا موقع ملا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اہل قلم ہمارا قیمتی سرمایہ ہیں اور میں آپ سب کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حال ہی میں رخصت ہونے والے دو بڑے ادیبوں اور دانشوروں جناب امجد اسلام امجد اور جناب ضیاء محیی الدین کی وفات پر اظہار افسوس کرتا ہوں۔ انکی رحلت ہمارا قومی نقصان ہے۔ اہل قلم کی اہمیت تحریک پاکستان کی کامیابی کے نتیجے میں ہی واضح ہو جاتی ہے کہ شاعر مشرق علامہ اقبال نے پاکستان کا خواب دیکھا اور ایک دانشور راہ نما قائداعظم نے اس خواب کو حقیقی تعبیر عطا کر دی۔

یہ بات خوش آئند ہے کہ موبائل اور انٹرنیٹ کے دور میں بھی نت نئے موضوعات پر کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ لاہور کے حالیہ لٹریچر فیسٹیول میں بہت سے بک سٹالوں پر میلے کی مناسبت سے ناشرین نے بھی دل کھول کر رعائت دے رکھی تھی۔ تاہم یہ لمحہ فکریہ ہے کہ ہمارے بچوں کے نتائج میں اردو اور اسلامیات میں نمبر دوسرے مضامین کی نسبت نمبر کم آ رہے ہیں۔ ہمیں اس جانب توجہ دینا ہوگی۔

ڈائریکٹر میڈیا نے گفتگو کو سمیٹتے ہوئے کہا کہ تمام احباب کی حقیقت افروز گفتگو نے میرے مؤقف کو مزید تقویت دے دی ہے کہ آج کے دور میں بھی درست سوجھ بوجھ رکھنے والے اہل قلم موجود ہیں اور میں پرامید ہوں کہ انکی راہنمائی میں مسائل کی دلدل میں پھنسا پاکستان جلد نکل کر ترقی کی شاہراہ پر دوڑنے لگے گا۔ میں آخر میں پرامید ہوں کہ آپ آئندہ بھی اپنا قیمتی وقت نکال کر نقطہ ءنظر کی نشستوں میں شریک ہو کر ٹرسٹ کے قومی مقاصد کو آگے بڑھائیں گے۔

☆☆☆